داستان عجم

از

خیال

جملہ حقوق بحق شاد بکڈپو چوکھہ پربت سری نگر محفوظ

سلسلہ مطبوعات

شاد بکڈپو

۱۹۳۵ع

شمارہ

۱۴

تعارف

از

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

میرے عزیز نادیدہ دوست مولوی حافظ سید ظہیر احمد صاحب شمسی متعلم جامعہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے فرمائش کی تھی کہ میں داستان عجم کے سلسلے میں خیال پر کچھ لکھدوں میں نے عذر کیا تھا کہ خیال نے فردوسی اور شاہنامہ کو اردو میں زندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُردو کے اس والمیکی (کو کون زندہ کرے اور کیسے کرے۔ تنقید پر تنقید لکھنی کچھ عجب سی معلوم ہوتی ہے۔ میں نواب خیال سے واقف اور اُن کا نیاز مند ضرور ہوں۔ لیکن مجھے کوئی حق نہیں پہونچتا۔ یہ کام خود بہار کے لوگوں کے کرنے کا ہے عزیز موصوف نہ مانے، چار ناچار مجھی کو تیار ہونا پڑا اور محض اس بنا پر کہ جس فرض کو کوئی نہ بجالائے اُس کا بجالانا علیگڈھ کا فرض ہے۔ ظاہر ہے مجھ سے بہتر علیگڈھ والے اس کام کو بہتر طور پر انجام دیسکتے ہیں لیکن میرے نزدیک کام کرنے کا بہترین ممکن العمل طریقہ یہ ہے کہ کام تو اولین لمحہ میں شروع کردیا جائے اور بہترین کام کرنے والے کی تلاش جاری

رکھی جائے۔ میں بھلے یا بُرے طریقہ پر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہوں
دوسرے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں۔

نواب خیال مرحوم سے غائبانہ تعارف مجھے عرصہ سے تھا۔ انکی سب سے پہلی تحریر جو میری نظر سے گذری، وہ خطبہ تھا جو موصوف نے لکھنؤ میں غالباً ۱۹۱۶ء میں دیا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ جبلی کے موقع پر دوبدو ملاقات کی نوبت آئی، نواب صاحب، ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے مہمان تھے۔ سہیل اسی زمانہ میں نکلا تھا جس میں نواب صاحب کا ایک مضمون داستان اردو شائع ہوا تھا۔ میں نے اطلاع کرائی، کھانے پر بیٹھ چکے تھے، فوراً بلا لیا بڑی شفقت اور محبت سے ملے اور نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا۔ کھانے پر تنہا تھے پلیٹ میں بھُنی ہوئی بٹیریں تھیں۔ کہنے لگے کھانا کھایئے اور باتیں کیجئے۔ میں نے کہا نواب صاحب کھانے میں عذر نہیں لیکن مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں، معلوم نہیں کسوقت باتیں بند کردوں اور صرف کھانا کھانے لگوں۔ نواب صاحب نے قہقہہ لگایا اتنے میں ڈاکٹر صاحب نکل آئے۔ واقعہ سُنکر اور بٹیروں کو خطرہ میں پاکر فرمایا نہیں نہیں رشید صاحب صرف میٹھی چیزیں کھاتے ہیں، نواب صاحب بولے، نہایت خوب، اچھا میٹھا منگوایئے۔ ڈاکٹر صاحب کو پیش بیش ہوا

تو میں نے کہا ڈاکٹر صاحب تکلیف نہ فرمایئے میں بٹیروں ہی پر شکر چھڑک لوں گا، ڈاکٹر صاحب نے ہنسکر فرمایا، خدا خیر کرے یہی عالم ہے تو پلیٹوں کی بھی خیر نہیں۔ نواب صاحب نے برجستہ فرمایا، خصوصًا چینی کی پلیٹیں!!

نواب صاحب کا یہ فقرہ ایک طور پر انکے اسلوبِ انشا کا بہترین ترجمان ہے، وہ رعایت لفظی کے بڑے دلدادہ تھے، ضلع جگت یا رعایت لفظی کا کسی زمانے میں بڑا دار دورہ تھا۔ لیکن اب یہ چیز پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی، مرصع و مسجع عبارت لکھنا، وزن اور قافیہ کا التزام یا رعایت لفظی کی نمائش اُن لوگوں یا اُن زبانوں میں عام ہوتی ہے جن کے لئے زبان غیر زبان کی حیثیت رکھتی ہے یا خود زبان ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے۔ صحیح سلیس، شیریں زبان لکھنی زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالیوں کی ابتدائی انگریزی تحریریں بالعموم ادق پر تکلف اور اکثر مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ اردو کی ابتدائی تحریریں بھی بالعموم مرصع مسجع اور مقفیٰ ہونے کے علاوہ غیر ہموار اور پیچیدہ ہوتی تھیں، جوں جوں اردو کا ذخیرہ بڑھتا گیا، زبان سلجھتی گئی اور ادائے مطالب کے اسلوب ڈھلتے گئے۔ بحیثیت زبان کے خود اردو کا وزن وقار بھی بڑھتا گیا۔ اردو لکھنے والو

میں اردو کی طرف سے اعتماد (اردو اعتمادی فی) بڑھا اور تکلف و تصنع جو
بے اعتمادی کی دلیل ہے خود بخود زائل ہو گیا۔

مرصع اور پر تکلف اردو کا دلکش صحیح اور صالح نمونہ آزاد (محمد حسین)
کی تحریریں ہیں۔ ان کی زبان میں شیرینی اور روانی ہے، ذہن میں پختگی ہے
اور قلم اس طور پر رقص کرتا ہے کہ کہیں سے بقول خیال بے تالا نہیں ہوتا۔
آزاد کے انشا و بیان کی رنگینی و رعنائی کا تجزیہ کیجیئے تو معلوم ہو گا کہ
آزاد نے رنگینی و رعنائی پیدا نہیں کی ہے بلکہ یہ چیز از خود پیدا ہوتی گئی ہے
رنگینی یا رعنائی بجائے خود کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ آرٹسٹ کا کمال یہ ہے
کہ وہ ان کو صحیح محل پر برسر کار لائے" عروس" و حجلۂ عروس" دونوں
معقول چیزیں ہیں لیکن" تلوار" و نیام" کو ان سے وابستہ کرنا خوش فعلی ہو
تو ہو خوش مذاقی قطعاً نہیں ہے۔ اسی طور پر گھوڑے کو زیور پہنانا اور
ٹاپ کی آواز سے زیادہ اسکے گھونگرو کے بجنے سے لطف اندوز ہونا یا تو
مایوس الحال اور مجہول فکر شعرا کا کام ہے یا دیہاتی زمینداروں کا!!

اردو اور فارسی شعر و شاعری میں متوسطین کے کلام و انداز گو انکے
بعد آنے والوں نے دور از کار موہوم و مبہم استعارہ تشبیہ و کنایہ سے
زیادہ لطیف بناتے بناتے دقیق پیچ در پیچ اور گنجلک کر دیا جس کا سبب
یہ تھا کہ موخر الذکر، اسی فضا میں چکر لگاتے رہے جس کے چپہ چپہ اور

گوشہ گوشہ سے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ اور کہیں کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی تھی، لامحالہ انکے پیرؤوں کو بھی وہی چیزیں جو ابتدا میں نازک، لطیف اور سادہ تھیں زیادہ دقیق اور پیچیدہ پیرایہ میں بیان کرنی پڑیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چیز بھول بھلیاں، یا گورکھ دھندا، بن گئی +

آزاد اور خیال کے موازنہ میں متذکرہ صدر صورت حال کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ آزاد نے جس چیز کو جس طور پر دنیا کو پہونچا دیا تھا، خیال نے اُسی کو زیادہ وسیع، زیادہ واضح اور زیادہ گہرے رنگ میں پیش کیا ہے، اور خوب کیا ہے لیکن یہی وسعت اور گہرائی بڑھتے بڑھتے کہیں کہیں ایسا رنگ لائی ہے کہ ع ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیئے

آزاد کی انشاپردازی آزاد کی انفرادیت یا تشخص کی بھی حامل ہے، وہ صاحب طرز ہیں۔ اسی زمرہ میں ابو الکلام۔ حسن نظامی۔ سجاد انصاری، اور مہدی افادی آتے ہیں۔ ان کا اور ان کی انشاپردازی کا مطالعہ مفید اور ناگزیر ہے لیکن ان کی نقل یا تقلید بے سود اور لاحاصل ہے!

خیال کو میں بہار کا آزاد سمجھتا ہوں، خیال آزاد کے پیرو ہوں یا نہوں لیکن وہ غیر شعوری طور پر اس وادی میں ضرور داخل ہو گئے ہیں جو آزاد کی دریافت کی ہوئی اور آزاد کی بسائی ہوئی تھی۔ خیال کو اس فضا میں عزت کی جگہ دی گئی۔ اور اس میں شک نہیں کہ خیال نے

اس اعزاز کو نبھایا بھی سکے لئے ساتھ ساتھ میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ خیال کے بعد یہ وادی اب ارض موعودہ، نہیں بلکہ ارض ممنوعہ ہو گئی ہے اور بہتر یہی ہے کہ آیندہ اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کیجائے۔
اب یہاں متاع یوسفی نہیں صرف میاں رہ گئی ہیں!

آزاد کی انشا پردازی ٹکسالی ہے۔ ان کا ادب وانشا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ خیال بہار کے تھے بالقوی، بالطبع، باللسان، اور بالانشا، (اگر یہ ترکیب جائز ہو)۔ وہ بہار کے مخصوص الفاظ، لب و لہجہ اور بول چال کو ٹکسالی میں لانا چاہتے تھے[1] ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیزیں ٹکسالی میں داخل ہو سکیں گی یا نہیں لیکن خیال نے ان کو اکثر و بیشتر جس خوبی و خلوص سے برتا یا نبھایا ہے اس سے تعجب بھی نہیں کہ کبھی ان کو ٹکسالی میں داخل ہونے دیا جائے۔

آزاد اور خیال جس اسلوب انشا کے دلدادہ تھے وہ دلکش اور دلفریب ضرور ہے اور وہی ان کا مقصد بھی ہے لیکن اس قسم کی تحریروں کا ایک

---

[1] مثلاً اُپی تلوار یعنی (ننگی تلوار) غیریت (مغائرت) جھماٹ پیڑ (تناور گنجان درخت) حد کا گورا (حد درجہ گورا) بزار (بازار) چنندہ (چیدہ) ڈھندان (ویران) گُتھی ہو جائیں (گُتھ جائیں) سن سنتاون (۱۸۵۷ء) پرک چکے تھے ( ) نونہال ہیکے گا ( )

نقص یہ بھی ہے کہ یہ تنقید و تحقیق کی زبان نہیں ہے۔ آپ ان کے ساتھ
بڑے لطف سے رہنموں رہ سکتے ہیں لیکن اکثر اسکی نوبت بھی آئیگی کہ آپ
اپنے آپ کو الفاظ اور عبارت کی طلسم آرائیوں میں مقید و مبتلا پائیں گے
ممکن ہے نجات بھی پا جائیں لیکن بصیرت سے محروم رہیں گے، ان سے
تفریح ہو سکتی ہے، تشنگی رفع نہیں ہو سکتی۔

داستان اردو کو (جس کا ایک حصہ مغل اور اردو ہے) وہ اپنی زندگی کا
کارنامہ سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں جس جوش و خلوص کے ساتھ اور
لطف لے لے کر اپنے نظریے بیان کئے ہیں وہ بجائے خود لطف انگیز ہیں اور
قابل اعتنا بھی۔ اردو کی ابتدا و ارتقا سے متعلق۔ اب بہت سی باتیں منظر
عام پر آگئی ہیں لیکن خیال نے اس طرف بہت پہلے اشارے کر دیے تھے۔
خیال زبان کے قضیئے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے وہ اس کو چکانا چاہتے تھے۔
اپنے خلوص سے جسکی جھلک ان کے اسلوب انشا میں ملتی ہے، اپنے ان بڑھین
و بیانات سے جو اقوام ہند (بالخصوص ہندو مسلمان) کے باہمی ارتباط پر
مشتمل تھے اور اپنی شخصیت سے جو ہر دلعزیز تھی۔

وہ اردو کو ہندوستان کی فطری اور تمدنی زبان بتلاتے تھے اور اردو
کو اسی راستہ پر لانا اور دیکھنا چاہتے تھے جس پر وہ خود پھوٹی، پنپی، اور پروان
چڑھی۔ اسی پر وہ ہندو مسلمان کی نجات کا انحصار رکھتے تھے، اردو کی

داستان انھوں نے حتی الوسع اُردو ہی کی زبان میں سنائی ہے اور لطف یہ ہے کہ اُردو کی شباہت و شیرینی، گہرائی و گیرائی کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔

ان کی تحریر کا یہ اسلوب امتیاز خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے کہ ان کو اگر نہایت ہی مخصوص طور پر کسی نہایت ہی مخصوص موضوع پر کہنا نہیں ہوتا تو وہ اس انداز سے لکھتے گویا وہی فضا، وہی افراد، وہی مواقع، اور وہی رنگ و آہنگ پیش کر رہے ہیں جس کا اظہار مقصود ہے۔ اس میں وہ اس درجہ غلو کرتے تھے کہ اکثر اصل مقصد نظر انداز ہو جاتا تھا مثلاً اُردو کی تاریخ کے سلسلہ میں انھوں نے ہندوستان کا تمدن اس لطف و خوبی سے پیش کیا ہے کہ اُردو کی تاریخ سے آگہی ہو یا نہو اس زمانہ اس فضا اور اس تمدن سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جس میں بقول خیال اُردو پیدا ہوئی اور پھولی پھلی!

داستان اُردو بھر داستان اُردو ہے (کم سے کم جہاں تک اسکے مختلف اجزا شائع ہو چکے ہیں) چنانچہ لطف داستان کے لئے کہیں کہیں چیزیں گھٹائی بڑھائی گئی ہیں۔ بذاتہٖ مجھے نواب مرحوم کی بعض اُن تاویلات سے اتفاق نہیں ہے جو انھوں نے داستان اردو، داستان عجم یا ہماری شاعری[۱] میں پیش کی ہیں۔ نقد و جرح کا یہ محل نہیں ہے

[۱] مطبوعہ رسالہ جامعہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء (جامعہ ملیہ دہلی)

ورنہ عرب و عجم و ایران و تاتار، فردوسی و انیس کے سلسلے میں بعض ایسے مباحث چھڑ گئے ہیں جہاں باوجود کوشش کے میں نواب خیالؔ کے ساتھ ہمنورد نہ رہ سکا۔

میں ممدوح کے مخصوص اسلوب انشاپردازی کا معترف ہوں، ان کے مخصوص عقائد کا نہ پرستار ہوں نہ ذمہ دار۔ ناظرین سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ بھی خیالؔ کو اسی نظر سے دیکھیں اور پرکھیں اور خوش ہوں۔ اب میں جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتا ہوں جن کو میں خیالؔ کے اسلوب انشا کا ترجمان سمجھتا ہوں۔

مقتبس از داستان عجم

معرکۂ رستم و سہراب

سلحشوروں کی کثرت و وحشت، باجوں کی کرخت و سخت آوازوں سلاح جنگ کی شدتوں، اور رعدتوں سے ہوا غلیظ و گرم ہوئی۔ زمین دہلی، پہاڑ ہلے اور ڈول گئے! ایرانی و تورانی بھڑے، سہراب کی رستمی نے کاؤس کے لشکروں کو تہ و بالا کر دیا، کس کا یارا جو اس کا وار اپنا دا کرے کاؤس چپ، رستم خموش، فوج ششدر اور لشکریوں میں بھگدڑ رہے، دن گذرا رات آئی، افسران سپاہ ملے بیٹھے۔

شور بپا ہوا، رستم سہراب کے مقابلہ پر تیار ہو گیا دلاوروں کی جان میں جان آئی، سانس لی اور

تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

صبح ہوئی، سورج نکلا، فوجیں بھی نکلیں، رستم اسوقت اپنا نام بدل کر میدان میں آیا، سہراب ادھر سے بڑھا اور دونوں گتھ گئے، تلواریں شپا شپ چلنے، ان سے آگ نکلنے اور شعلے بھڑکنے لگے۔ باپ بیٹے لڑ رہے، زخم کھا رہے ہیں، مگر ایک دوسرے کو پہچانتا نہیں ہے، اس رستخیز میں شام ہو گئی، دونوں کا پردہ رہ گیا، دوسری صبح، صبح قیامت تھی، رستم اور سہراب میدان میں اُترے اور تلوار چلنے لگی۔

بہ زخم اندروں تیغ مشد ریز ریز

چہ رزمے کہ پیدا کند رستخیز

تلواریں ٹوٹ رہیں، زخم پڑ رہے، ریز ریز رہے، اور گر پڑا گر پڑا، قیامت ہے، تماشہ ہے، میدان میں دو ہیں۔ ۶

یکے سال خوردہ یکے نوجواں

سہراب تھک گیا، رستم بھی ہانپ رہا ہے۔ جوان نے بڈھے کی حالت دیکھی، تلوار روک لی اور لڑائی دوسرے دن پر اُٹھا رہی، رات

تو میں نے کہا ڈاکٹر صاحب تکلیف نہ فرمائیے میں بٹیروں ہی پر شکر چھڑک لوں گا، ڈاکٹر صاحب نے ہنسکر فرمایا، خدا خیر کرے یہی عالم ہے تو پلیٹوں کی بھی خیر نہیں۔ نواب صاحب نے برجستہ فرمایا، خصوصًا چینی کی پلیٹیں!!

نواب صاحب کا یہ فقرہ ایک طور پر انکے اسلوبِ انشا کا بہترین ترجمان ہے، وہ رعایت لفظی کے بڑے دلدادہ تھے، ضلع جگت یا رعایت لفظی کا کسی زمانے میں بڑا دار دورہ تھا۔ لیکن اب یہ چیز پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی، مرصع و مسجع عبارت لکھنا، وزن اور قافیہ کا التزام یا رعایت لفظی کی نمائش اُن لوگوں یا اُن زبانوں میں عام ہوتی ہے جن کے لئے زبان غیر زبان کی حیثیت رکھتی ہے یا خود زبان ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے۔ صحیح سلیس، شیریں زبان لکھنی زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالیوں کی ابتدائی انگریزی تحریریں بالعموم ادق پر تکلف اور اکثر مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ اردو کی ابتدائی تحریریں بھی بالعموم مرصع مسجع اور مقفّیٰ ہونے کے علاوہ غیر ہموار اور پیچیدہ ہوتی تھیں، جوں جوں اردو کا ذخیرہ بڑھتا گیا، زبان سلجھتی گئی اور ادائے مطالب کے اسلوب ڈھلتے گئے۔ بحیثیت زبان کے خود اردو کا وزن وقار بھی بڑھتا گیا۔ اردو لکھنے والوں

یں اردو کی طرف سے اعتماد (اردو اعتمادی) بڑھا اور تکلف و تصنع جو بے اعتمادی کی دلیل ہے خود بخود زائل ہو گیا۔

مرصع اور پر تکلف اردو کا دلکش صحیح اور صالح نمونہ آزاد (محمد حسین) کی تحریریں ہیں۔ ان کی زبان میں شیرینی اور روانی ہے، ذہن میں پختگی ہے اور قلم اس طور پر رقص کرتا ہے کہ کہیں سے بقول خیال بے تالا نہیں ہوتا۔ آزاد کے انشا و بیان کی رنگینی و رعنائی کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ آزاد نے رنگینی و رعنائی پیدا نہیں کی ہے بلکہ یہ چیز از خود پیدا ہوتی گئی ہے۔ رنگینی یا رعنائی بجائے خود کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ آرٹسٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ ان کو صحیح محل پر بر سر کار لائے "عروس" و حجلۂ عروس" دونوں معقولی چیزیں ہیں لیکن "تلوار" و "نیام" کو ان سے وابستہ کرنا خوش فعلی ہو تو ہو خوش مذاقی قطعاً نہیں ہے۔ اسی طور پر گھوڑے کو زیور پہنانا اور ٹاپ کی آواز سے زیادہ اسکے گھونگرو کے بجنے سے لطف اندوز ہونا یا تو مایوس الحال اور مجہول فکر شعرا کا کام ہے یا دیہاتی زمینداروں کا!!

اردو اور فارسی شعر و شاعری میں متوسطین کے کلام و انداز گو انکے بعد آنے والوں نے دور از کار موہوم و مبہم استعارہ تشبیہ و کنایہ سے زیادہ لطیف بناتے بناتے دقیق، پیچ در پیچ اور گنجلک کر دیا جس کا سبب یہ تھا کہ موخر الذکر، اسی فضا میں چکر لگاتے رہے جس کے چپہ چپہ اور

گوشہ گوشہ سے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ اور کہیں کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی تھی، لامحالہ انکے پیرؤنکو بھی وہی چیزیں جو ابتدا میں نازک لطیف اور سادہ تھیں زیادہ دقیق اور پیچیدہ پیرایہ میں بیان کرنی پڑیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چیز بھول بھلیاں، یا گورکھ دھندا، بن گئی +

آزاد اور خیاؔل کے موازنہ میں متذکرہ صدر صورت حال کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ آزاد نے جس چیز کو جس طور پر دنیا کو پہونچادیا تھا، خیاؔل نے اُسی کو زیادہ وسیع، زیادہ واضح اور زیادہ گہرے رنگ میں پیش کیا ہے، اور خوب کیا ہے لیکن یہی وسعت اور گہرائی بڑھتے بڑھتے کہیں کہیں ایسا رنگ لائی ہے کہ "ناطقہ سربگریباں ہے کہ اسے کیا کہئے"

آزاد کی انشاپردازی آزاد کی انفرادیت یا تشخص کی بھی حامل ہے، وہ صاحب طرز ہیں۔ اسی زمرہ میں ابوالکلام۔ حسن نظامی۔ سجاد انصاری، اور مہدی افادی آتے ہیں۔ ان کا اور ان کی انشاپردازی کا مطالعہ مفید اور ناگزیر ہے لیکن ان کی نقل یا تقلید بے سود اور لاحاصل ہے!

خیاؔل کو میں بہار کا آزاد سمجھتا ہوں، خیاؔل آزاد کے پیرو ہوں یا نہوں لیکن وہ غیر شعوری طور پر اس وادی میں ضرور داخل ہو گئے ہیں جو آزاد کی دریافت کی ہوئی اور آزاد کی بسائی ہوئی تھی۔ خیاؔل کو اس فضا میں عزت کی جگہ دی گئی۔ اور اس میں شک نہیں کہ خیاؔل نے

اس اعزاز کو نبھایا ہے کے لئے ساتھ ساتھ میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ خیالؔ کے بعد یہ وادی اب ارضِ موعودہ، نہیں بلکہ ارضِ ممنوعہ ہو گئی ہے اور بہتر یہی ہے کہ آیندہ اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کیجائے۔

اب یہاں متاعِ یوسفی نہیں صرف میاں رہ گئی ہیں!

آزاد کی انشاپردازی ٹکسالی ہے۔ ان کا ادب و انشا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ خیالؔ بہار کے تھے بالقومی بالطبع، باللسان، اور بالانشاء (اگر یہ ترکیب جائز ہو)۔ وہ بہار کے مخصوص الفاظ، لب و لہجہ اور بول چال کو ٹکسالی میں لانا چاہتے تھے۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیزیں ٹکسالی میں داخل ہو سکیں گی یا نہیں لیکن خیالؔ نے ان کو اکثر و بیشتر جس خوبی و خلوص سے برتا یا نبھایا ہے اس سے تعجب بھی نہیں کہ کبھی ان کو ٹکسالی میں داخل ہونے دیا جائے۔

آزاد اور خیالؔ جس اسلوبِ انشا کے دلدادہ تھے وہ دلکش اور دلفریب ضرور ہے اور وہی ان کا مقصد بھی ہے لیکن اس قسم کی تحریروں کا ایک

سلہ — مثلاً اُپی تلوار یعنی (ننگی تلوار) غیریت (مغائرت) جھماٹ پیڑ (تناور گنجان درخت) حد کا گورا (حد درجہ گورا) بزار (بازار) چنندہ (چیدہ) ڈھندان (ویران) گتھی ہو جائیں (گتھ جائیں) سن سنتاون (۱۸۵۷ء) پرک چکے تھے (   ) نونہال بچے کا (   )

نقص یہ بھی ہے کہ یہ تنقید وتحقیق کی زبان نہیں ہے۔ آپ لنکے ساتھ بڑے لطف سے رہنموں رہ سکتے ہیں لیکن اکثر اسکی نوبت بھی آئیگی کہ آپ اپنے آپ کو الفاظ اور عبارت کی طلسم آرائیوں میں مقید و مبتلا پائیں گے ممکن ہے نجات بھی پاجائیں لیکن بصیرت سے محروم رہیں گے، ان سے تفریح ہوسکتی ہے، تشنگی رفع نہیں ہوسکتی۔

داستان اُردو کو (جس کا ایک حصہ مغل اور اردو ہے) وہ اپنی زندگی کا کارنامہ سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں جس جوش وخلوص کے ساتھ اور لطف لے لے کر اپنے نظریے بیان کئے ہیں وہ بجائے خود لطف انگیز ہیں اور قابل اعتنا بھی۔ اردو کی ابتدا و ارتقا سے متعلق۔ اب بہت سی باتیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن خیال نے اس طرف بہت پہلے اشارے کردیے تھے۔ خیال زبان کے قضیئے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے وہ اس کو چکانا چاہتے تھے۔ اپنے خلوص سے جسکی جھلک ان کے اسلوب انشا میں ملتی ہے، اپنے ان براہین وبیانات سے جو اقوام ہند (بالخصوص ہندو مسلمان) کے باہمی ارتباط پر مشتمل تھے اور اپنی شخصیت سے جو ہر دلعزیز تھی۔

وہ اُردو کو ہندوستان کی فطری اور تمدنی زبان بتلاتے تھے اور اُردو کو اسی راستہ پر لانا اور دیکھنا چاہتے تھے جس پر وہ خود پھوٹی، پنپی، اور پروان چڑھی۔ اسی پر وہ ہندو مسلمان کی نجات کا انحصار رکھتے تھے، اردو کی

داستان انھوں نے حتی الوسع اُردو ہی کی زبان میں سنائی ہے اور لطف یہ ہے
کہ اُردو کی شباہت و شیرینی، گہرائی و گیرائی کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔
ان کی تحریر کا یہ اسلوب و امتیاز خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے کہ ان کو
اگر نہایت ہی مخصوص طور پر کسی نہایت ہی مخصوص موضوع پر کہنا نہیں ہوتا
تو وہ اس انداز سے لکھتے گویا وہی فضا، وہی افراد، وہی مواقع، اور وہی
رنگ و آہنگ پیش کر رہے ہیں جس کا اظہار مقصود ہے۔ اس میں وہ اس
درجہ غلو کرتے تھے کہ اکثر اصل مقصد نظر انداز ہو جاتا تھا مثلاً اُردو
کی تاریخ کے سلسلہ میں انھوں نے ہندوستان کا تمدن اس لطف و خوبی
سے پیش کیا ہے کہ اُردو کی تاریخ سے آگہی ہو یا نہ ہو اس زمانہ اس فضا اور
اس تمدن سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جس میں بقول خیال اُردو پیدا
ہوئی اور پھولی پھلی!

داستان اُردو پھر داستان اردو ہے (کم سے کم جہاں تک اسکے
مختلف اجزا شائع ہو چکے ہیں) چنانچہ لطف داستان کے لئے کہیں کہیں
چیزیں گھٹائی بڑھائی گئی ہیں۔ بذاتہ مجھے نواب مرحوم کی بعض اُن تاویلات
سے اتفاق نہیں ہے جو انھوں نے داستان اردو، داستان عجم
یا ہماری[1] شاعری میں پیش کی ہیں۔ نقد و جرح کا یہ محل نہیں ہے

[1] مطبوعہ رسالہ جامعہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء (جامعہ ملیہ دہلی)

ورنہ عرب و عجم (ایران و تاتار ، فردوسی و انیس کے سلسلے میں بعض ایسے مباحث چھڑ گئے ہیں جہاں باوجود کوشش کے میں نواب خیالؔ کے ساتھ ہمنورد نہ رہ سکا ۔

میں ممدوح کے مخصوص اسلوب انشاپردازی کا معترف ہوں، ان کے مخصوص عقائد کا نہ پرستار ہوں نہ ذمہ دار ۔ ناظرین سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ بھی خیالؔ کو اسی نظر سے دیکھیں اور پرکھیں اور خوش ہوں ۔ اب میں جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتا ہوں جن کو میں خیالؔ کے اسلوب انشا کا ترجمان سمجھتا ہوں ۔

مقتبس از داستان عجم

معرکۂ رستم و سہراب

سلحشوروں کی کثرت و وحشت، باجوں کی کرخت و سخت آوازوں، سلاح جنگ کی شدتوں، اور حدتوں سے ہوا غلیظ و گرم ہوئی ۔ زمین دہلی، پہاڑ ہلے اور ڈول گئے ! ایرانی و تورانی بھڑے، سہراب کی رستمی نے کاؤس کے لشکروں کو تہہ و بالا کر دیا، کس کا یارا جو اس کا وار اٹھا کرے کاؤس چپ، رستم خموش، فوج ششدر اور لشکریوں میں بھگدڑ رہے، دن گذرا رات آئی، افسران سپاہ ملے بیٹھے ۔

شور نی ہوا، رستم سہراب کے مقابلہ پر تیار ہو گیا دلاوروں کی جان میں جان آئی، سانس لی اور

تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

صبح ہوئی، سورج نکلا، فوجیں بھی نکلیں، رستم اسوقت اپنا نام بدلکر میدان میں آیا، سہراب ادھر سے بڑھا اور دونوں گتھ گئے، تلواریں شپا شپ چلنے، ان سے آگ نکلنے اور شعلے بھڑکنے لگے۔ باپ بیٹے لڑ رہے، زخم کھا رہے ہیں، مگر ایک دوسرے کو پہچانتا نہیں ہے، اس رستخیز میں شام ہو گئی، دونوں کا پردہ رہ گیا، دوسری صبح، صبح قیامت تھی، رستم اور سہراب میدان میں اُترے اور تلوار چلنے لگی۔

بہ زخم اندروں تیغ شد ریز ریز

چہ زخمے کہ پیدا کند رستخیز

تلواریں ٹوٹ رہیں، زخم پڑ رہے، ریز ریز ہے، اور گر نیزا گر نیزہ۔ قیامت ہے، تماشہ ہے، میدان میں دو ہیں۔ ۶

یکے سال خوردہ یکے نوجواں

سہراب تھک گیا، رستم بھی ہانپ رہا ہے۔ جوان نے بڈھے کی حالت دیکھی، تلوار روک لی اور لڑائی دوسرے دن پر اُٹھا رہی، رات

مرہم پٹی میں کٹی، صبح ہو گئی، سورج پھر اپنی شان سے نکلا، رستم اور سہراب بھی کمریں کسکر نکلے، آج اخیر دن اور فیصلہ ہے۔ دونوں میدان میں کودے اب تلواریں توڑی گئیں اور نیام ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، پہلوان نزدیک آئے۔

بہ کشتی گرفتن نہادند سر
گرفتند ہر دو دوال کمر

پٹکوں پر ہاتھ پڑے، گاؤ زوریاں شروع ہو گئیں، رستم نے آخر سہراب کو پکڑا، ہچکولہ دیکر اُٹھایا۔ سر سے اونچا کیا، چکر دیا، اور دے ٹپکا۔

زدش بر زمیں بر، بہ کردار شیر
بدانست گو ہم نماند بہ زیر

مقتبس از داستان اردو — آریوں کی آمد

"یہ غیر آریا ابھی اس باغ کی ہوا ہی کھا رہے اور اسکی بہار ہی دیکھ رہے تھے، کہ وسط ایشیا کے پلیٹوں سے ایک سورما قوم اُٹھی جو آندھی کی طرح بہت جلد آدھی دنیا پر چھا گئی۔ یہ وہی شیر تھے جو ایک طرف (مغرب) جھپٹے تو ایران، یونان، روما، اندلس، اور انگلستان کو

طمانچے مار کر نکل گئے اور دوسری جانب (مشرق) پلٹے تو چینؔ ماچینؔ کو دبوچتے ہوئے ہمالیہ کے سر چڑھے وہاں برسوں گونجتے اور پھر انڈلسؔ و برہم پترؔ کے کچھار میں مدتوں ہونکتے رہے ...."
آریئے اپنے دیس سے بنجاروں کی طرح نکلے، نیا دانا نیا پانی کھاتے پیتے بہت دور چلے آئے۔ یہاں قافلہ کے ٹکڑے ہوئے ایک پچھم چلا اور دوسرا پورب کو مڑا۔ اس طرف جسنے منہ کیا وہی ہمارے آریا ہیں جو ٹھیکے لیتے ہوئے اخیر پنجاب تک آئے اور یہاں دریائی قلعوں میں گھر گئے۔ یہ جگہ انھیں بہت بھائی، اپنی بستی بسائی اور کھیتی لگائی۔ انڈسؔ بڑا مسافر نواز تھا، انھیں جلد اپنا کرلیا یہ بھی اسکے ہوگئے۔ ...... وہ کشادہ زمین اور پاٹ دار دریا۔ یہ مدتوں وہاں پڑے رہے ان کی آسودگی کا چرچا پھیلا جس نے ان کے دوسرے بھائیوں کو بھی ادھر کھینچا، زمین جھگڑے کا گھر اور بھائیوں کا بگاڑ، آدم کی خو ہے۔ بنتی کیونکر؟ خم ٹھکے، وہ بڑھے، یہ ہٹے اور دبتے دبتے پوری حد کے کنارے جا لگے۔

ایضاً مہابھارت (جنگ اور جوا)

سب طرف امن چین ہے مگر کورؔو ارام سے نہیں، اندر پرست کا

شہر اور پانڈوں کا نام سُن سُن کر اور بھی جلتے ہیں۔ انھیں دعوت دے دے کر بلاتے اور کسی طرح یدھشٹر کو بہکا کر پانڈو کو جوئے پر لگاتے اور دغا کا پاسا پھینک کر سب کچھ ان کا چھین لیتے ہیں۔ جواری کی جھجل مشہور ہے، یدھشٹر اب بھائیوں پر بازی لگاتے اور ایک ایک کر کے انھیں بھی ہار جاتے ہیں۔ مطیع بھائی اُف نہیں کرتے اور بڑے کا حکم خدا کے فرمان کی طرح مانتے ہیں۔ کورو اس پر بغلیں بجاتے خوشی کا نرسنگھ پھونکتے، آوازے کستے اور یدھشٹر کو تیہا ولاتے ہیں!!

ہارا جواری جان پر کھیلتا ہے، یدھشٹر اپنی چہیتی اور جیتی ہوئی رانی دروپدی کو داؤ پر رکھ دیتے ہیں۔ پاسہ بدی کر رہا ہے۔ کسی طرح نہیں پلٹتا اور یدھشٹر آخر انھیں بھی ہار کر اور ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کورو دروپدی کو ذلیل کرتے، ان کے بال پکڑ کر کھینچتے اور اس بھری محفل میں انھیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ راجہ دھرت اب تک چپ تھے مگر عورت ذات اور پھر گھر کی عزّت اور بھتیجوں کے ناموس کو اس طرح نہ دیکھ سکے۔ جوے پر ملامت کرتے، بیٹوں کو ڈانتے، بھتیجوں کو چھڑاتے اور ان کا راج ان کے حوالہ کر کے رخصت کرتے ہیں۔

کورو اب بھی نہیں بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں بعد سادہ دل یدھشٹر کو پھر پھانستے اور جوئے کا دام پھر بچھاتے ہیں۔ کورو جیتتے اور پانڈے پھر ہارتے اور آخر بارہ برس کی بن باس لیتے ہیں۔

اس میعاد کے گذرنے اور دنیا کی ٹھوکر کھانے کے بعد پانڈے سنبھلتے اور ایک جرّار لشکر لے کر کوروؤں پر چڑھتے ہیں۔ وہ بھی اپنی ٹڈی دل فوج لیکر ادھر سے بڑھتے ہیں، ملک بھر کے راجہ سمٹ آتے اور ادھر یا اُدھر ہو جاتے ہیں اور ہستنا پور کے میدان میں بھائی بھائیوں میں (مہا بھارت کی) لڑائی چھڑ جاتی ہے۔ دونوں فوجیں بھڑتی، ٹکراتی اور دنیا سر پر اُٹھا لیتی ہیں۔ اٹھارہ دن آسمان چکر میں اور زمیں بھونچال میں رہی۔ وہ خاک اُڑی کہ سورج زرد اور چاند گرد ہو گیا۔ یدھشٹر کے نیزے نکل کے گھوڑے۔ سہدیو کی تیغ بھیم کے گرز اور ارجن کے تیروں اور پھر سری کرشن جی کی دعاؤں نے دشمن پر آگ برسا دی۔ وہ رن پڑا کہ الامان! کورو ساتھی سمیت کھیت رہے اور پانڈے مردی کا نشانہ اڑاتے ہستنا پور پہونچے اور سارے راج کے مالک ہو گئے۔

بڈھے راجہ دھرت اب تک جی رہے تھے مگر بیٹوں کے غم میں اندھے اور چور چور ہو گئے تھے۔ دل کسی حال بہلتا اور ٹھہرتا

نہ تھا، آخر بی بی اور بھاوج کا ہاتھ پکڑ جنگل کی طرف نکل گئے اور وہاں
پاؤں پھیلا کر ہمیشہ کے لئے سو گئے !

یہاں **پانڈے** گو راج پج رہے ہیں مگر دل چین سے اور دماغ
آرام سے نہیں۔ ایسی لڑائی اور ایسے خون کا سماں ہر وقت آنکھوں میں
پھرتا ہے، جی چھوٹا اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایک دن دنیا کی بے ثباتی
کا ذکر نکلا، اور اس نے ایسا اثر کیا کہ پانچوں بھائی راج پاٹ چھوڑ
فقیری لیتے اور دروپدی سمیت بنوں میں جا رہتے ہیں اور وہاں تپشیا
کرتے اور اندر کی یاد میں دن گذارتے ہیں !!

ایضًا — رام لیلا اور بھرت ملاپ :-

راجہ دسرتھ بوڑھے ہوئے تو یوو راج کی فکر ہوئی۔ بھائی بند،
رشتہ دار، نوکر چاکر، رعیت پرجا آئے گئے، سب کی نظر انھیں رام
پر تھی۔ راجہ بھی یہی چاہتے تھے۔ مگر رائے سب کی لی اور سب نے ایک
مونہہ ہو کر رام رام ہی کہا !

راجہ شاد ہوئے بیٹے کو بلا کر خوش خبری سنائی اور اسیوقت سے
اس رسم کی ادائیگی اور جشن کی تیاری ہونے لگی۔

رنواسوں (محلات) میں بھی اس کا چرچا ہوا، ہر طرف شادی

رچی مگر رانی کیکئی کے گھر ماتم رہا۔ انھوں نے دیکھا کہ رام آج یودراجہ (نائب) اور کل راجہ بنے تو کوسیلا کا راج اور میرا بڑا دہاڑا ہوگا اور جب تک بھرت گدّی نہ پائیں میری کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑیں۔ راجہ رات کو اندر آئے تو رانی کو پڑا دیکھ کر گھبرائے، حال پوچھا، کچھ نہ کھلا، بہت اصرار کیا تو بولیں کہ مہاراج آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو دو باتیں تم چاہوگی ہم پوری کریں گے، اُس کا وقت آگیا۔ اب قول پورا کیجئے۔ راجہ کیا جانتے تھے کہ کیا کہا جائیگا۔ جواب دیا کہ ہاں ہاں، وہ کونسی بات ہے جو تم کہو اور پوری نہو۔ کیکئی تڑپ کر بولی کہ بھرت کو راج اور رام کو بن باس ملے!

یہ سُنکر راجہ دھک سے ہوگئے، صبح ہوئی۔ آج جشن کا دن اور بڑی تیاریاں تھیں، شہر میں چہل پہل اور محل میں خل فل تھا۔ دربار تیار اور درباری بے چین کہ مہاراج جلد باہر آئیں اور رام گدّی پائیں۔ بڑی دیر ہوئی، اندر خبر گئی، راجہ نے بیٹے کو بلایا اور ماجرا کہہ سُنایا، راج کا وارث پاؤں پر گر کر بولا، مہاراج زبان ہار چکے۔ یہ کہتے ہوئے ماں اور بی بی کے پاس جا خود حال کہا اور بن باس پر تیار ہوگئے۔ سیتا اور لچھمن انھیں اکیلا کیونکر چھوڑتے ما

دونوں ساتھ ہوئے اور تینوں نکلے۔ محل ویران، شہر سنسان ہو گیا۔
ایک خلقت ٹوٹی اور اپنے شاہزادہ کو شہر کے ناکہ تک پہونچا آئی۔

چودہ برس کٹ چکے اور مصیبت کے دن نکل چکے تھے۔

دونوں بھائی رانی سمیت کوسل کو چلے کہ بھرت سے ملیں اور وعدہ پورا کریں۔ کوسیلا جی اُٹھیں۔ بھرت شادی مرگ ہو گئے۔ سارے شہر میں ایک عید تھی، مندروں، شوالوں میں گھنٹے بجتے، ایک دوسرے سے ملتے اور مبارکی دیتے۔ بھرت سب کو لیکر بھائی سے ملنے نکلے سارا شہر ٹوٹا، آدمی پر آدمی، گھوڑے پر گھوڑے، رتھ پر رتھ پیچھے گیندا (پھول) اُچھالتے، ابیر اُڑاتے، ناکہ تک پہونچے۔ رام لچھمن ادھر سے بڑھے، بھرت دوڑے بھائی کے پیر چومے انھوں نے اُٹھایا گلے سے لگایا اور اب تینوں ایک رتھ میں بیٹھا اور سیتا کو دوسرے میں بٹھا، سونے کے پھول مٹھیوں سے پھینکتے، زر اُچھالتے جواہر داستے محل تک پہونچے!

کوسیلا دوڑیں، سمیترا بڑھیں، کیکئی بھی آئیں۔ سب نے ہار دیئے اور پھر جشن تازہ ہوئی، محل سجایا، دربار لگایا گیا۔ رام راج گدّی پائینگے بڑی بھیڑ بڑا جماؤ اور بڑی گھما گھمی تھی۔ رام لچھمن۔ بھرت۔ سترگن۔ چاروں بھائی ساتھ آئے اپنے

اپنے عہدوں سے بیٹھے، بھرت بڑھے، بھائی (راجہ) کا ہاتھ پکڑ مسند تک لائے، بٹھایا، مبارک سلامت کی دھوم مچی، سنکھ پھکنے اور گھنٹے بجنے لگے، اس دھوم دھام میں راجہ دسرتھ سب کو یاد آگئے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں، ان کے چرچے بھی رہے۔ برہمن بھی آئے راجہ (سرگ باشی) کے نام پر دان ہوا اور پھر ریت رسم ادا ہونے اور خوشی کے باجوں سے مستی چھانے لگی، چھٹی ہوئی تو ایک گھوڑا لایا اور بل دیا گیا اور دربار برخاست ہوا!!

خیال مرحوم اکثر علی گڈھ آئے، ان کی بڑی تمنا تھی کہ علی گڈھ ہی میں مستقل قیام کرتے اور اردو کی خدمت بجا لاتے۔ یہاں کے بہت سے لوگوں سے مانوس ہوگئے تھے، بڑے باغ و بہار آدمی تھے، حفظ مراتب کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، ملنے جلنے میں اہتمام و تکلف مد نظر رکھتے اور دوسروں سے بھی اسکی توقع کرتے تھے۔ طبیعت مشرقی تھی انداز مغربی اردو پر جان دیتے تھے۔ اور اردو کی ہر بڑی تحریک سے اپنے کو وابستہ کرتے۔ اپنی خاندانی وجاہت و امارت پر فخر کرتے تھے اور یہ صحیح بھی ہے کہ جس طرح اودھ میں انیس اور ان کے خاندان نے اردو کی پشتہا پشت خدمت کی، نواب مرحوم اور ان کے

مرہم پٹی میں کٹی، صبح ہو گئی، سورج پھر اپنی شان سے نکلا، رستم اور سہراب بھی کمریں کسکر نکلے، آج اخیر دن اور فیصلہ ہے۔ دونوں میدان میں کودے اب تلواریں توڑی گئیں اور نیام ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، پہلوان نزدیک آئے۔

بہ کشتی گرفتن نہادند سر
گرفتند ہر دو دوال کمر

پٹکوں پر ہاتھ پڑے، گاؤزوریاں شروع ہو گئیں، رستم نے آخر سہراب کو پکڑا، ہیچکولہ دیکر اُٹھایا۔ سر سے اونچا کیا، چکر دیا، اور دے پٹکا۔

زدش برزمیں بر، بہ کردار شیر
بدانست گوہم نماند بہ زیر

مقتبس از داستانِ اردو — آریوں کی آمد

"یہ غیر آریا ابھی اس باغ کی ہوا ہی کھا رہے اور اسکی بہاریں دیکھ رہے تھے، کہ وسط ایشیا کے ٹیلیوں سے ایک سورما قوم اُٹھی جو آندھی کی طرح بہت جلد آدھی دنیا پر چھا گئی۔ یہ وہی شیر تھے جو ایک طرف (مغرب) جھپٹے تو ایران، یونان، روما، اندلس، اور انگلستان کو

طمانچے مار کر نکل گئے اور دوسری جانب (مشرق) پلٹے تو چین، ماچین کو دبوچتے ہوئے ہمالیہ کے سر چڑھے وہاں برسوں گونجتے اور پھر اندلس و برہم پتر کے کچھار میں مدتوں ہونکتے رہے ....،

آریئے اپنے دیس سے بنجاروں کی طرح نکلے، نیا دانا نیا پانی کھاتے پیتے بہت دور چلے آئے۔ یہاں قافلہ کے ٹکڑے ہوئے ایک پچھم چلا اور دوسرا پورب کو مڑا۔ اس طرف جسنے منہ کیا وہی ہمارے آریا ہیں جو ٹھیکے لیتے ہوئے اخیر پنجاب تک آئے اور یہاں دریائی قلعوں میں گھر گئے۔ یہ جگہ انھیں بہت بھائی، اپنی بستی بسائی اور کھیتی لگائی۔ انڈس بڑا مسافر نواز تھا، انھیں جلد اپنا کرلیا یہ بھی اسکے ہو گئے۔ ...... وہ کشادہ زمین اور پاٹ دار دریا۔ یہ مدتوں وہاں پڑے رہے ان کی آسودگی کا چرچا پھیلا جس نے ان کے دوسرے بھائیوں کو بھی ادھر کھینچا، زمین جھگڑے کا گھر اور بھائیوں کا بگاڑ، آدم کی خو ہے۔ بنتی کیونکر؟ خم ٹھکے، وہ بڑھے، یہ ہٹے اور دبتے دبتے پوری حد کے کنارے جا لگے۔

ایضاً

مہابھارت (جنگ اور جوا)

سب طرف امن چین ہے مگر کورو آرام سے نہیں، اندر پرست کا

شہرا اور پانڈوں کا نام سُن سُن کر اور بھی جلتے ہیں۔ انھیں دعوت دے دے کر بلاتے اور کسی طرح یدھشٹر کو بہکا کر پانڈو کو جوئے پر لگاتے اور دغا کا پاسا پھینک کر سب کچھ ان کا چھین لیتے ہیں۔ جواری کی جھل مشہور ہے، یدھشٹر اب بھائیوں پر بازی لگاتے اور ایک ایک کر کے انھیں بھی ہار جاتے ہیں۔ مطیع بھائی اُف نہیں کرتے اور بڑے کا حکم خدا کے فرمان کی طرح مانتے ہیں۔ کورو اس پر بغلیں بجاتے خوشی کا نرسنگھا پھونکتے، آوازے کستے اور یدھشٹر کو تیہا دلاتے ہیں!!

ہارا جواری جان پر کھیلتا ہے، یدھشٹر اپنی چہیتی اور جیتی ہوئی رانی دروپدی کو داؤں پر رکھ دیتے ہیں۔ پاسہ بدی کر رہا ہے۔ کسی طرح نہیں پلٹتا اور یدھشٹر آخر انھیں بھی ہار کر اور ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کورو دروپدی کو ذلیل کرتے، ان کے بال پکڑ کر کھینچتے اور اس بھری محفل میں انھیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ راجہ دھرت اب تک چپ تھے مگر عورت ذات اور پھر گھر کی عزّت اور بھتیجوں کے ناموس کو اس طرح نہ دیکھ سکے۔ جوے پر ملامت کرتے، بیٹوں کو ڈانٹتے، بھتیجوں کو چھڑاتے اور ان کا راج ان کے حوالہ کر کے رخصت کرتے ہیں۔

کورو اب بھی نہیں بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں بعد سادہ دل یدھشٹر کو پھر بہلاتے اور جوئے کا دام پھر بچھاتے ہیں۔ کورو جیتتے اور پانڈے پھر ہارتے اور آخر بارہ برس کی بن باس لیتے ہیں۔

اس میعاد کے گذرنے اور دنیا کی ٹھوکر کھانے کے بعد پانڈے سنبھلتے اور ایک جرّار شکر لیکر کوروں پر چڑھتے ہیں۔ وہ بھی اپنی ٹڈی دل فوج لیکر ادھر سے بڑھتے ہیں، ملک بھر کے راجہ سمٹ آتے اور ادھر یا اُدھر ہو جاتے ہیں اور ہستنا پور کے میدان میں بھائی بھائیوں میں (مہابھارت کی) لڑائی چھڑ جاتی ہے۔ دونوں فوجیں بھڑتی، ٹکراتی اور دنیا سر پر اُٹھالیتی ہیں۔ اٹھارہ دن آسمان چکر میں اور زمین بھونچال میں رہی۔ وہ خاک اُڑی کہ سورج زرد اور چاند گرد ہو گیا۔ یدھشٹر کے نیزے نکل کے گھوڑے۔ سہدیو کی تیغ بھیم کے گرز اور ارجن کے تیروں اور پھر سری کرشن جی کی دعاؤں نے دشمن پر آگ برسادی۔ وہ رن پڑا کہ الامان! کورو ساتھی سمیت کھیت رہے اور پانڈے مردی کا نشانہ اڑاتے ہستناپور پہونچے اور سارے راج کے مالک ہو گئے۔

بڈھے راجہ دھرت ابتک جی رہے تھے مگر بیٹوں کے غم میں اندھے اور چور چور ہو گئے تھے۔ دل کسی حال بہلتا اور ٹھہرتا

نہ تھا، آخر بی بی اور بھاوج کا ہاتھ پکڑ جنگل کی طرف نکل گئے اور وہاں
پاؤں پھیلا کر ہمیشہ کے لئے سو گئے!

یہاں پانڈے گو راج بچ رہے ہیں مگر دل چین سے اور دماغ
آرام سے نہیں۔ ایسی لڑائی اور ایسے خون کا سماں ہر وقت آنکھوں میں
پھرتا ہے، جی چھوٹا اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایک دن دنیا کی بے ثباتی
کا ذکر نکلا، اور اس نے ایسا اثر کیا کہ پانچوں بھائی راج پاٹ چھوڑ
فقیری لیتے اور دروپدی سمیت بنوں میں جا رہتے ہیں اور وہاں تپشیا
کرتے اور اندر کی یاد میں دن گذارتے ہیں!!

ایضاً — رام لیلا اور بھرت ملاپ :-

راجہ دسرتھ بوڑھے ہوئے تو یوراج کی فکر ہوئی۔ بھائی بند،
رشتہ دار، نوکر چاکر، رعیت پرجا آئے گئے، سب کی نظر انہیں رام
پر تھی۔ راجہ بھی یہی چاہتے تھے۔ مگر رائے سب کی لی اور سب نے ایک
مونہہ ہو کر رام رام ہی کہا!

راجہ شاد ہوئے بیٹے کو بلا کر خوش خبری سنائی اور اسیوقت سے
اس رسم کی ادائیگی اور جشن کی تیاری ہونے لگی۔

رنواسوں (محلات) میں بھی اس کا چرچا ہوا، ہر طرف شادی

رہی مگر رانی کیکئی کے گھر ماتم رہا۔ انھوں نے دیکھا کہ رام آج یو دراجہ (نائب) اور کل راجہ بنے تو کوسیلا کا راج اور میرا بڑا دہاڑا ہوگا اور جب تک بھرت گدّی نہ پائیں میری کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑیں۔ راجہ رات کو اندر آئے تو رانی کو پڑا دیکھا گھبرائے، حال پوچھا، کچھ نہ کھلا، بہت اصرار کیا تو بولیں کہ مہاراج آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو دو باتیں تم چاہو گی ہم پوری کریں گے، اُس کا وقت آگیا۔ اب قول پورا کیجیے راجہ کیا جانتے تھے کہ کیا کہا جائیگا۔ جواب دیا کہ ہاں ہاں وہ کونسی بات ہے جو تم کہو اور پوری نہو۔ کیکئی تڑپ کر بولی کہ بھرت کو راج اور رام کو بن باس ملے!

یہ سُنکر راجہ دھک سے ہوگئے، صبح ہوئی۔ آج جشن کا دن اور بڑی تیاریاں تھیں، شہر میں چہل پہل اور محل میں خل فل تھا۔ دربار تیار اور درباری بے چین کہ مہاراج جلد باہر آئیں اور رام گدّی پائیں۔ بڑی دیر ہوئی، اندر خبر گئی، راجہ نے بیٹے کو بلایا اور ماجرا کہہ سُنایا، راج کا وارث پاؤں پر گر کر بولا، مہاراج زبان ہار چکے۔ یہ کہتے ہوئے ماں اور بی بی کے پاس جا خود حال کہا اور بن باس پر تیار ہو گئے۔ سیتا اور لچھمن انھیں اکیلا کیونکر چھوڑتے ،

دونوں ساتھ ہوئے اور تینوں نکلے۔ محل ویران، شہر سنسان ہو گیا۔
ایک خلقت ٹوٹی اور اپنے شاہزادہ کو شہر کے ناکہ تک پہونچا آئی۔

یہ چودہ برس کٹ چکے اور مصیبت کے دن نکل چکے تھے۔

دونوں بھائی رانی سمیت کوسل کو چلے کہ بھرت سے ملیں اور وعدہ پورا کریں۔ کوسیلا جی اٹھیں۔ بھرت شادی مرگ ہو گئے۔ سارے شہر میں ایک عید تھی، مندروں، شوالوں میں گھنٹے بجتے، ایک دوسرے سے ملتے اور مبارک دیتے۔ بھرت سب کو لیکر بھائی سے ملنے نکلے سارا شہر ٹوٹا، آدمی پر آدمی، گھوڑے پر گھوڑے، رتھ پر رتھ پیچھے گیندا (پھول) اچھالتے، ابیر اڑاتے، ناکہ تک پہونچے۔ رام لچھمن ادھر سے بڑھے، بھرت دوڑے بھائی کے پیر چومے انھوں نے اٹھایا گلے سے لگایا اور اب تینوں ایک رتھ میں بیٹھا اور سیتا کو دوسرے میں بٹھا، سونے کے پھول مٹھیوں سے پھینکتے، زر اچھالتے جواہر داستے محل تک پہونچے!

کوسیلا دوڑیں، سمیترا بڑھیں، کیکئی بھی آئیں۔ سب نے ہار دیئے اور پھر جشن تازہ ہوئی، محل سجایا۔ دربار لگایا گیا۔ رام راج گدی پائینگے بڑی بھیڑ بڑا جماؤ اور بڑی گھما گھمی تھی۔ رام لچھمن۔ بھرت۔ سترگن۔ چاروں بھائی ساتھ آئے اپنے

اپنے عہدوں سے بیٹھے، بھرت بڑھے، بھائی (رام) کا ہاتھ پکڑ
مسند تک لائے، بٹھایا، مبارک سلامت کی دھوم مچی، سنکھ
پھکنے اور گھنٹے بجنے لگے، اس دھوم دھام میں راجہ دسرتھ
سب کو یاد آ گئے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں، ان کے چرچے بھی رہے۔
برہمن بھی آئے راجہ (سرگ باشی) کے نام پر دان ہوا اور پھر
ریت رسم ادا ہونے اور خوشی کے باجوں سے مستی چھانے لگی چھٹی
ہوئی تو ایک گھوڑا لایا اور بل دیا گیا اور دربار برخاست ہو!!

خیال مرحوم اکثر علی گڈھ آئے، ان کی بڑی تمنا تھی کہ علی گڈھ ہی میں مستقل
قیام کرتے اور اردو کی خدمت بجا لاتے۔ یہاں کے بہت سے لوگوں
سے مانوس ہو گئے تھے، بڑے باغ و بہار آدمی تھے، حفظ مراتب
کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، ملنے جلنے میں اہتمام و تکلف مدنظر رکھتے اور
دوسروں سے بھی اسکی توقع کرتے تھے۔ طبیعت مشرقی تھی انداز مغربی
اردو پر جان دیتے تھے۔ اور اردو کی ہر بڑی تحریک سے اپنے کو
وابستہ کرتے۔ اپنی خاندانی وجاہت و امارت پر فخر کرتے تھے
اور یہ صحیح بھی ہے کہ جس طرح اودھ میں انیس اور ان کے خاندان
نے اردو کی پشتہا پشت خدمت کی، نواب مرحوم اور ان کے

خاندان نے بھی مدت مدید تک بہار میں اردو کا علم بلند کیا اور رکھا اور جس زمین کو انیس نے آسمان بنایا اس میں نواب مرحوم اور انکے خاندان نے مہ و اختر چمکائے ہے۔

افسوس کہ بہار کا یہ درخشندہ تارہ افق ہستی سے حال ہی میں روپوش ہوا ہے۔ خدا اسکو دین و دنیا دونوں میں تابناک رکھے۔

رشید احمد صدیقی
صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ

۱۳۵۴ھ

مقدمہ

(از حضرت آقائے عباس شوستری)

سر ولیم جونس (SIR WILLIAM JONS) در ۱۷۷۴ء مختصر تعریفے از شاہنامہ نمود و از آں وقت سلسلۂ تحقیق و تفتیش در شاہنامہ و گویندۂ آں میان اُدبا و نویسندگانِ اروپا آغاز گشت۔ در ۱۸۲۰ گورس (GORRES) شاہنامہ را کاملاً بہ المانی ترجمہ کرد و ۹ سال پس از آں اٹکنسن (ATKINSON) انگلیسی بہ انگلیسی و پس از او ژول مل (JULESMOHL) فرانسوی بہ فرانسہ ترجمہ کرد و ضمناً یک عدہ زیادہ از ایران شناس ہائے اروپا بخصوص در المان و فرانسہ و روس و انگلیس بہ فردوسی و شاہنامۂ او مشغول شدند و اُستاد اتہ (ETHE) تحقیق فاضلانہ از مندرجات شاہنامہ کرد و ہم چنیں اُستاد نولدکہ (NOLDEKE) مقالہ بسیار مہمی بر نظم مذکور بہ زبان المانی نوشت کہ ترجمۂ آں بگ دن اف (BOGDANAV) در ۱۹۳۰ بہ انگلیسی نمود و یک ترجمۂ منظوم یا شرح افسانہ ہائے باستانِ ایران کہ در شاہنامہ ذکر شدہ اند ارتور جورج وارنر و ادمند وارنر (ARTHUR GEORGE WARNER and EDMOND WARNER)

نمودند۔ علامہ براون (BROWN) نیز در تاریخ ادب ایران شرح
از فردوسی نوشتہ متاسفانہ دریں میدان خود ایرانیہا عقب ماندہ بودند
بہترین مقالۂ کہ از قلم یک نفر ایرانی بفارسی نوشتہ شدہ مقالہ ایست
کہ در مجلۂ کاوہ طبع برلین شائع شدہ در ہند علامہ مرحوم شبلی در
شعر العجم شرح از فردوسی و شاہنامہ نگاشتہ ولی باز ہم حق زحمات
فردوسی بہ فارسی و اُردو ادا نہ شدہ بود تا اینکہ بہ فرمان اعلیحضرت
پہلوی ایرانیہا جشن ہزار سالہ فردوسی را گرفتند و کنگرہ ئی از ایران
شناسہائی شرق و غرب در طہران منعقد گردید و سائر ملل متمدن در
ہمان آیام بہ پیروی ایرانیہا در شہرہائی خود شان جشن مذکور را برپا
نمودند و ہر کس ہرچہ در خزینہ معلومات خویش داشت گفت و
مورد توجہ مردم شد۔ این ترتیب ہزار سال پس از وفات شاعر بزرگ
ملل متمدن خدمات او را بہ عالم ادب اعتراف نمودند و ہم چنانکہ او
می فرماید "عجم زندہ کردم بدین پارسی" ایرانی نیز نام او را زندہ باد نمود
دانشمندان اروپا و آشیا و امریکا در خصوص شاہنامہ و گویندۂ آن
مقالہ ہا نوشتند و کنج کاوی ہائی مہم نمودند۔ ادبای ایران نیز دریں
مرتبہ از دیگران پس نبودند بلکہ در عالم تحقیق پیش رفتند و مقالہ ہائی مہم از
آنہا در مجلہ مہتر (فردوسی نامہ) و دیگر مجلہ ہا و روزنامہ ہا درج و طبع گشتند

متاسفانه درین مورد عقیدتی وجوششی که دوستانِ اروپا نسبت به بزرگترین شاعرِ رزم گوئی ایران اظهار نمودند از برادرانِ هندی که وابستگی و تعلقات آنها به ایران از همه ملل نزدیکتر است مشاهده نشد مگر اینکه از خوش بختی چندی پیش جناب ظهیر احمد صاحب چند مقالهٔ مرحوم نواب نصیر حسین خیالؔ (عظیم آبادی) را نزد بنده فرستادند. خواندم و خوشنود شدم و مطمئن گشتم که هنوز در هند اشخاص هستند که باوجود بُعد زمان و نبودن تعلق ادبی ایران را فراموش نکرده اند. مقاله هائی مذکور به زبانِ اُردو نوشته شده اند والحق اگر کسے بخواهد یکی از بهترین نمونه از عبارت فصیح اُردو را بخواند باید رجوع به این کتاب بکند. عبارتش بسیار فصیح و طرز بیان دلچسپ گیرنده است از هر لفظِ آں پدید است که نویسنده یک اخلاق صمیمانه به فردوسی و شاهنامه داشته عمده مقصودش تمجید بود نه تنقید و تفتیش و زحمت کشیده به اندازهٔ دسترس تحقیق و تجسس کرده و آنچه فهمیده به یک پیرایهٔ بسیار دلکش تقدیم خوانندگان نموده، گمان نمیکنم درین موضوع کتابی بهتر ازیں به اُردو نوشته شده، علاقه مندی نویسنده از عبارتِ ذیل (که در صفحه ۹ آں کتاب خوانده‌ام و اگرچه ترجمه لفظی نیست ولے با اصل اختلافے نیز ندارد) خوانندگان اندازه خواهند نمود. می فرماید:-

"جام جمشیدی و صبح و عصر نوروزی و تقسیم ماه و سال یا تقویم که فردوسی

جام جہاں نمامی نامد اگر کسی نداند و مار ہائی ضحاک تازی را زخم ہائی آنہا

و پر ہائی سیمرغ را پرہائی اکسیر صفت و شفا دہندہ نسنجد و در افسانۂ رستم و

ہفت خوان و رخش و سہراب و گلگون و دشت ہاموں و کشت ترکان حکایات

تاریخی را ادراک نہ نماید۔ یقیناً بیان فردوسی را سراسر افسانہ خواہد گفت و

ہمچنیں اگر بہ حسن کنایات و اشارات و تشبیہات و استعارات و تلمیحات شاہنامہ

پی نبرد از خواندن آں متاثر و متلذذ نگردد و اگر از واقعات گذشتہ کہ

بصورت افسانہ در ایران و چین و دیگر ممالک جمع شدہ اند آشنا نباشد

البتہ از کتاب عجم (کہ عجم زندہ کردم بدیں پارسی است) ناآشنا خواہد ماند

ایں است کہ دلہائے پژمردہ و مغزہائے افسردہ بہ کہنہ رمز و کنایہ آں زندہ

کن ایران نمی رسند و سحر البیان او را اندازہ نکنند و از نام افسانہ مانند

او حقیقت را در نیارند و بہ سبب بے بضاعتیِ خود شاہنامہ را محض کتاب افسانہ

گویند چنیں اشخاص باید بدانند کہ شاہنامہ افسانہ نیست بلکہ تاریخی است

کہ بزبانِ افسانہ جمع شدہ یا افسانہ ایست کہ میتواں بر روئے اساس آں

عمارت بلند تاریخ را بنا کرد تا وقتیکہ افسانہ ہائی باستان را مورخین بالمرہ

مطرود نکردہ اند مندرجات شاہنامہ را کسی نمی تواند رد بکند"۔

این است مشتی از خروار یا شمۂ از بسیار کہ مرحوم نواب نصیر حسین

در شاہنامہ خود شان فرمودہ اند ہر کسی بخواہد از گل و ریاحین ایشان

بهره بیابد به اصل رجوع بکند۔ مرحوم نواب به کنج کاوی های خشک و
حواله به این کتاب کرم خورده یا آں مرحوم قریب العہد فردوسی که امروز
مطلوب ست اصلا نه پرداخته۔ یک نویسنده کنونی باید نه به بست کتاب پوشیده رجوع
بکند که عمرہ چه روزی و چه ساعتی و چه ماهی چه سالی زاد و چه سالی دنیا را
پدرود کرد یا اینکه ہنگام تولد او پدرش زنده بود یا مادرش مرده بود۔ در این
نوع بحث و تفتیش یک نیمه عمر خود را گم نکرده بلکه میتواں گفت طرز تحریرش
بیشتر ادبیانه و شاعرانه می باشد۔ فی الجمله تحقیق در افسانه های ایران نموده
و بعضی از آنها را با افسانه های چین و دیگر ممالک تطبیق کرده ولی در این
زمینه نمی تواں گفت، مطلب تازه ئی تقدیم خوانندگان نموده بهر صورت
صرف نظر از چند اشتباه که اهمیت ندارند شاهنامه مرحوم نواب نصیر حسین
بهترین تقریظی است که بر شاهنامه بزبان اُردو نوشته شده

عباس شوستری

احوالِ واقعی

اپنے محترم بزرگ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور حضرت آقائے عباس شوستری مہاراجہ کالج میسور کا بجاں سپاس گذار ہوں کہ ان ارباب ادب و فن نے مجھ ناچیز کی نیازمندانہ درخواست کی پذیرائی فرمائی اور "داستانِ عجم" پر تعارف اور مقدمہ لکھکر اس فرض سے عہدہ برا ہوئے جو ہندوستان اور ایران کا فرض عین نہیں تو فرض کفایہ ضرور ہے۔

شاد بکڈپو سے وابستگی کی بنا پر طابع اور ناشر کی حیثیت سے نواب خیال پر تنقید نہ تو میرے لئے ضروری ہے نہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی اور آقائے عباس شوستری کے ارشادات کے بعد اضافہ کی کوئی ضرورت۔ بہار رہتی دنیا تک خیال کا سپاس گذار رہے گا اور شاد بکڈپو کا کام اقلیم علم و ادب کے اس یگانہ روزگار تاجدار کی بارگاہ میں عقیدت و احترام کا وہ ہدیہ محقر پیش کرتا ہے جو اس کا جائز حق ہے۔

میں خیال کا مداح ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں غالی مداح ہوں تعارف میں محترمی صدیقی صاحب نے اپنے منصفانہ خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "خیال کو میں بہار کا آزاد سمجھتا ہوں اور خیال کے بعد یہ وادی اب ارض موعودہ نہیں بلکہ ارض ممنوعہ ہوگئی ہے۔ مجھے بصد ادب احترام صرف یہ کہنا ہے کہ محمد حسین آزاد کے قلم کی بہار آفرینوں کے بعد بھی اساتذہ سخن

کی یہی رائے تھی کہ یہ وادی اب ارض ممنوعہ ہو چکی ہے۔ لیکن خود پروفیسر صدیقی صاحب کے قول کے مطابق خیالؔ نے اس وادی میں قدم رکھا اور حق یہ ہے کہ رہرو اور رہنما کی شان پیدا کی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کہ اہل یورپ ہمارے ملک میں آئے اور اپنے ساتھ نئی زبان، نئے خیالات، نئی معاشرت، نیا فلسفہ نئی حکومت، نئے علوم وغیرہ لائے تو ہماری طبیعتوں میں بڑا انقلاب ہو گیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ہر چیز کو کچھ اور ہی نظر سے دیکھنے لگے۔ اخلاق کا نظریہ، سوسائٹی کا تخیل، مذہب کا تعقل، حسن و قبح کا معیار، باہمی تعلقات کے شعور، سب کچھ بدل گئے۔ خود شعر و سخن کی تعریف، اس کا موضوع، اسکی حدود، نقد و نظر کے اصول، یہ سب چیزیں بھی بدل گئیں، اس صورت میں جو بات اگلوں کے نزدیک عین فطرت تھی، وہ اگر ہمیں خلاف فطرت اور محض رعایت لفظی معلوم ہو تو کیا تعجب ہے۔ پروفیسر محمد حسین آزادؔ ایسے مسلم الثبوت انشا پرداز اس روح عصری کی پیداوار ہیں جو مخصوص معیاروں کی پیروی کرتی تھی، بعض عقائد پر دل سے ایمان رکھتی تھی، زندگی کے بلند ترین مقصد اور اس کے حصول کے بہترین ذرائع کے بارے میں اسے کوئی شک نہ تھا، وہ اپنی سوسائٹی سے پوری ہمدردی رکھتی تھی۔ اپنے انتہائی باغیانہ انداز خیال میں بھی اس کی مسلمہ روایات پر بھی اعتراض نہ کرتی۔ اس کی خوشیوں اور غموں میں شریک تھی، خیالؔ نے ان حدود میں بغاوت کی اور آزادؔ سے بہت دور ایک مستقل عمارت کی بنا ڈالی جس میں عناصر کی کشمکش بھی ہے اور اضطراب بھی، آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ کا خطبۂ صدارت اور اس کا اسلوب بیان مغل اور اردو کی طرز نگارش اس کی زندہ مثالیں ہیں، خیالؔ نے مضمون کی لطافت کے

ساتھ ندرت پر بھی پوری توجہ کی، جس سے لطف اٹھانے کے لئے عظیم آبادی خاندانوں کا روزمرہ، ان کے محاورے، مثلیں، کنائے تلمیحیں، الفاظ کے محل استعمال مترادفات کے نازک فرق، اظہار جذبات کے طریقے، فصاحت کے رمز، بلاغت کے نکات سے حلاوت اندوز ہونے کی ضرورت ہے۔

خیاؔل کا قلم مناظر قدرت کا آئینہ رونما ہونے کے بجائے خوردبین کا شیشہ تھا، اس نے مرقع سخن میں صرف رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ فطرت کی کوتاہیاں ابھار ابھار کر دکھائیں اور اس کے ایک ایک رنگ میں تنوّ ستو رنگ بھرے۔ اسی سلسلہ میں اگر یہ اور اضافہ کر دیا جائے تو شاید بیجا نہ ہو کہ صدق جذبات اور جدتِ ادا خیاؔل کے سوا آزاؔد میں موجود ہی نہیں۔ نازک خیالی اور آرائش سخن میں البتہ آزاؔد ان کے شریک ہیں مگر شریک غالب نہیں۔ دونوں کی تخئیل کا میدان مختلف ہے، آزاد کی نازک خیالی کی بنیاد تاثرات قلب پر ہے۔ اور خیاؔل کی تخئیل کی بنا حقائق کونیہ اور معارف روحانیہ پر۔ خیاؔل میں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف معاملہ بندی کے۔ گویا وہ ایک ہی وقت میں ابوالکلام آزاد کی طرز کے بھی مالک ہیں۔ اور محمد حسین آزاؔد کے انداز میں بھی ماہر ہیں۔ ان کی تحریر کی شگفتگی میں کیفیت بھی ہے اور رنگینیت بھی۔ بلاغت بھی ہے اور فصاحت بھی خیاؔل کی مجتہدانہ اختراعوں نے اردو کی سلاست میں اشکال پیدا نہیں کیں اور مجموعی طور پر وہ نہایت دلپسند اور مفید ہیں بلکہ انصاف یہ ہے کہ آزاؔد کی ترکیبوں سے شوخ تر ہیں۔ کلام میں کہیں کہیں ترجیع و تقابل کی بدولت گبن Gibbon اور میکاؤلے Macaulay کی شان نظر آتی ہے خیاؔل کی مجتہدانہ ایجاد پسندی اور لاابالیانہ وارستہ مزاجی اتنی مہلت دیتی تو اس میں

شک نہیں کہ ادبِ اردو کے نثاروں میں انکا جواب ہوتا۔ انہوں نے انشاپردازی کو فن کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا۔ البتہ تفریح کی نیت سے کیا اور اپنے دوسرے مشاغل کی طرح سامان دلبستگی سمجھا۔ انہوں نے اردو میں سر سید، شبلی، حالی، آزاد کسیکی پیروی نہ کی بلکہ اپنی راہ دنیا سے الگ نکالی۔ حد ہوگئی کہ خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدت میں ابوالکلام آزاد اور ظفر علیخاں بھی ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ سننے والے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ وہ اس فن میں اپ اپنے استاد اور اپنے شاگرد تھے۔ انکا تتبع یقیناً کیا جاسکتا ہے، لیکن اس تتبع کے لئے ان غیر معمولی صلاحیتوں کا سرمایہ دار ہونا چاہیئے جو خیالؔ کے حصہ میں آئی تھیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ اسلوب بیان بالکل شخصی اور انفرادی ہوتا ہے۔ اور میں اس اصول کا قائل ہی نہیں ہوں کہ شخصی و انفرادی کمال میں وہی کمال پیدا کیا جاسکتا ہے جو اس کا معیار قرار پاچکا ہے۔ یہ تقلید محض بلکہ نقالی ہوگی۔ ان معنوں میں خیالؔ کی تقلید اور نقالی ضرور کی جاسکتی ہے، لیکن وہ جوہر اور آب کہاں!!

اس سے زیادہ مجھے لکھنے کا موقع نہیں۔ آخر میں ایک بار پھر اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مخلص و محترم بزرگ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ایسے نقاد فن کی توجہات گرامی مبذول کرانے میں کامیاب ہوا۔ اس نوازش بے پایاں کے لئے میں صمیم قلب سے انکا شکر گذار ہوں۔ میں حضرت آقائے عباس شوستری کے مقدمہ کو بھی اہل نظر کے مطالعہ کے لئے پیش کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اس تحقیق و تفحص کی قدرافزائی کی جائے گی۔ والسلام

سید ظہیر احمد شمسی عظیم آبادی
متعلم جامعہ شمس الہدیٰ

داستانِ عجم

یعنی

تبصرہ

(بر)

شاہنامۂ فردوسی

(از)

ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی

(باہتمام)

سید ظہیر احمد شمسی عظیم آبادی

(پروپرائیٹر)

شاد بکڈپو، چوگھرہ، پٹنہ سیٹی

مطبوعہ

برقی مشین پریس مراد پور بانکی پور پٹنہ

تعداد طبع دفعہ اوّل ایک ہزار (۱۰۰۰)

به نام خدائے زباں آفرین!

شاہ نامہ

آہُورا مزدا[1]

به گوش از سروشم بسے مژدہاست
دلم گنج گوہر زباں اژدہاست

ایران و فردوسی ۔ دنیا کے اور ملکوں کی قدیم تاریخ کی طرح ایران کی داستان پاستان بھی گم سمجھی جاتی ہے ۔ مگر ایسا ہے نہیں ۔ یونانیوں اور رومیوں کے نوشتوں اور پھر شاہنامہ کے سے کارنامہ کو اگر دل

---

[1] آہُورا مُزدا ۔ بمعنی رب الحکیم ۔ اُشو (حضرت) زردشت نے یہ مرکب لفظ اپنی کتابوں میں، بسم اللہ کی طرح استعمال کیا (آئین زردشت از عبداللہ رازی)

دے کر پڑھا جائے تو وہاں کے فراموش شدہ قصّہ کا وہ رشتہ مل جائے جس سے ایک اُلجھی ہوئی داستان سلجھ جائے۔

مگر غیر ملکیوں کی تحریروں پر ملکیوں کے نوشتوں کو ہمیشہ ترجیح دینی چاہیے۔ عرب کہتا ہے۔ اَهْلُ الْبَيْتِ اَدْرٰى بِمَا فِي الْبَيْتِ کسی گھر کے لوگ اپنے گھر کی زیادہ خبر رکھتے ہیں!۔ یہ قول فردوسی پر بھی صادق آتا ہے۔ اُس کا شاہنامہ، تاریخ عجم ہے۔ یہ کارنامہ وہاں کے قدیم نوشتوں، سینہ بہ سینہ روایتوں اور ملکی مثلوں اور کہاوتوں کو پیش نظر رکھ کر شروع اور ختم ہوا۔ یہ قصّے اور حکایت ہی ہیں۔ جن سے کسی ملک و قوم کا بے پردا ور اصلی رنگ کھلتا اور ان کا صحیح لب و لہجہ سمجھ میں آسکتا ہے۔

اسلئے **ضروریات و سیاسیات کے آلٹر پر صداقت ہمیشہ صدقہ کیگئی ہے!** جب جو چیز تحریر ہوئی اسمیں یہ ضرورت و سیاست کچھ نہ کچھ ضرور جھلکی۔ مگر شاہنامہ اس سے پاک ہے۔ اسلئے کہ اول تو اسکی بنیاد اُن ملکی روائتوں پر ہے جو صدیوں سے ایرانیوں کے سینوں ہی میں نہیں بلکہ اُن کے عوام کی زبانوں پر بھی تھیں اور اُسمیں وہ چیزیں داخل نہیں ہو سکتی تھیں جو پڑھے جنوں

کے دماغوں کی فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان پڑھ معصوم ہوتے اسلئے وہ ایسے
گناہوں سے پاک رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاہنامہ، اصل ایرانیوں اور
تورانیوں کی سیاسی اور مذہبی جنگوں کا ایک کارنامہ ہے۔ فردوسی کے وقت
میں نہ وہ کیانی باقی تھے اور نہ وہ تورانی (افراسیابی)، جو ان جنگوں کے
بانی ہوئے اور اُس کے نتیجہ سے فائدہ یا نقصان اٹھاتے رہے۔ اسلئے
اس شاہنامہ کا کوئی نیک و بد اثر اُن پر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور اسلئے فردوسی
کا یہ کلام اُن میں سے کسی ایک سے اچھا یا بُرا کوئی صلہ یا بدلا نہیں لے سکتا
تھا۔ تیسرے یہ کہ یہ شاہنامہ اس وقت شروع ہوا جبکہ دیلمی صاحب اختیار
اور سامانی برسر اقتدار تھے۔ ظاہر ہے کہ دیلمیوں کا میل ایرانیوں سے تھا
اور سامانیوں کا اپنے تورانیوں سے۔ فردوسی کا کوئی کلام ان دو میں سے
کسی کی گرفت میں نہ آسکا کیونکہ وہ حق تھا اور ضرورت و سیاست کی رنگ
آمیزیوں سے پاک و صاف۔ یہ شاہنامہ اگر ایک طرف فخر الدولہ (دیلمی)
کو خوش کرتا ہے تو دوسری طرف محمود (سامانی)، کو دونوں قدیم تاریخ ایران
سے واقف ہیں اسلئے فردوسی کی بات بات کے قدردان۔ اُنھوں نے
اس کارنامہ کو صحیح تاریخ عجم سمجھا۔ اور اُسے اپنے سر آنکھوں پر رکھا۔ اور اُن

کے بعد کی نسلیں بھی اُسے آنکھوں سے لگاتی اور اُس کے گلوں سے اپنا دامن بھرتی رہی ہیں!

اِس ملک نے بھی شاہنامہ کو ہمیشہ بڑی جگہ دی ہے اور جبتک ہمارے یہاں اپنا علم و کمال باقی رہا یہ کتاب عجم، رحلوں پر رکھی گئی اور یہ عقیدت بڑھی گئی۔ مگر انگریزی کی غلامی نے جبکہ اپنی مادری زبان اُردو سے ہم کو آزاد کر دیا تو فارسی اور پھر اسکے اصلی و صحیح مذاق سے ہم کو یگانگی کیونکر ہو سکتی ہے؟ تاریخ ایران سے بیخبری، اُس زمین کی فطری پیداوار سے نابلدی اور وہاں کی قدیم روایتوں سے دوری کی وجہ سے شاہنامہ اب تاریخ عجم نہیں بلکہ دِیوُوں کا ایک کاغذی کوہ قاف اور پریوں کا اندری اکھاڑا سمجھا جاتا ہے۔ اس ملک میں تعلیم بڑھ گئی اور علم گھٹ گیا ہے۔ اِاس لئے اپنی (ذاتی) تحقیقات سے گریز اور دوسروں کی کمائی پر ہمارا گذارا ہے۔ ہم میں بہت کم لوگ ہیں جو کسی کلام و تصنیف کے منشا و غایت پر نظر کرتے ہوں۔ اور اس وجہ سے وہ چیزیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور جب نہیں سمجھتے تو ان سے گارہ رہتے اور بیدردی سے اُن پر منہہ آتے ہیں!

اہل ہوش کتاب حواس سے پڑھتے ہیں۔ سُنو۔ بسم اللہ۔ وَالتِّینِ وَ

الزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِينِ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِي اَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِينَ۔ تمکو ورد ہوگا۔ مگر جبتک تین و زیتون کی تاریخی اور رحمت بھری شامی[1] پہاڑیوں اور سینا کی برق ادا لن ترانیوں کو نہ سمجھو، دماغوں میں وہ تجلی کیونکر آئے گی کہ کوہِ ابو قبیس کے دامن میں بسے ہوئے ایک امین قوم کے پر امن شہر کی بزرگی کو سمجھ سکو اور کعبۂ مقصود تک پہونچ سکو۔ تین و زیتون اور اُس طُور بے ستون تک تمھاری رسائی نہ ہو سکی تو ایسی سوگندوں کے دبدبے کیونکر متاثر ہوگے اور اپنی خلقت کی عظمت و ضرورت کس طرح تمھارے دماغوں تک آئے گی اور ایک بلند مقام سے اپنے کرتوت کی بدولت، قعر مذلت میں گر جانے کی حقیقت تم پر کیا آشکارا ہو سکے گی؟! تم اس کلام کو نہ سمجھے تو بازار مصر

---

[1] شام میں، تین و زیتون (Olive and Figs moutains) نام دو پہاڑ تھے۔ بنی اسرائیل کے اکثر نبیوں نے وہاں پناہ لی انکی وجہ سے وہ یہودیوں میں مقدس سمجھے گئے (تفسیر تورات از سلیمان ربی در عبرانی سنہ ۹۷ء، مترجمہ مسیو شارلیان فرنچ سنہ ۱۸۷۶ء) یہاں کوہ طور (سینا) کی رعایت سے وہ مقدس پہاڑیاں یاد کی گئیں کہ سیاق کلام یہی تھا۔ بعد کو مکہ کی عظمت بتائی گئی کہ وہ کوہ ابو قبیس کے دامن میں بسا ہوا حضرت ابراہیم کو یاد دلاتا ہے۔ اب جبتک ان پہاڑوں کا حال معلوم نہو کلام کا حسن کیونکر دکھائی دیگا؟ اسی لاعلمی سے تین و زیتون کے ظاہر معنے بتائے گئے اور کلام اللہ کا حسن ظاہر نہ ہو سکا۔

کے میوہ فروشوں کی آواز اَلتِّیْنُ مِنَ الشَّامِ[1] پر دوڑو گے، دوسرا سودا کر لوگے اور خسارے میں رہو گے!

سنو ؎

چنیں دید گوئندہ یک شب بخواب — کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب

دقیقی ز جائے پدید آمدے — بر آں جام مے داستانہا زدے

بہ فردوسی آواز دادے کہ مے — مخور جز بہ آئین کاؤس کے

تم نے سُنا۔ لیکن اگر خواب کی حقیقت، مے و مینا[2] کی اصلیت اور موقعہ پر دقیقی کے یوں آجانے کی علت اور پھر کاؤس کے سے آئین پرست کی مے نوشی کی غایت اور اسکی تاریخی حکایت کو نہ سمجھ سکے تو فردوسی اور دقیقی کے اُس زردشت کو کیا خوب سمجھے جسکا ذکرِ خیر ان شعروں کے بعد آتا اور ایران جس کے پیغام سے گونج جاتا ہے! شاہنامہ کے اکثر شارح (اور

---

[1] مصر کے بزاروں میں میوہ فروش صدا لگاتے ہیں کہ۔ شام سے آئی ہوئی انجیر۔س (تین) خریدو۔ مطلب یہ ہو کہ اگر اس سورہ کے تین کے معنی محض انجیر کے سمجھے گئے تو قرآن کا مطلب ہی فوت ہو گیا۔

[2] فردوسی کے یہاں مے و مینا خاص معنوں میں آتے ہیں اور اسکی لفظ داستان اور دہقان بھی تفسیر طلب ہے۔ ان چیزوں کو سمجھے بغیر شاہنامہ تو بڑی چیز ہے، تم، خیام اور حافظ کے کلام کو بھی سمجھ نہیں سکتے!

خصوصاً انگریز) ان نکتوں اور باریکیوں کو بہت کم سمجھتے ہیں۔ اس مادہ میں مغربی[1] و مشرق کے مزاج و مذاق کا بھی فرق ہے۔ اپنی لاعلمی سے وہ (انگریز) اُلجھتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے تحریر فرما دیتے ہیں۔ اور افسوس یہ کہ ہمارے انگریزی خواں اُن کے بیانوں کی تقلید کرنے لگتے ہیں!

سُنو ؎

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر — مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن — تجھے بات میں آسماں کر دیا

کی سی حقیقت اور غدر (۱۸۵۷ء) سے قبل کے ملکی حالات اور اس وقت کی ادب گردی کو تم نے نہ جانا تو انیسؔ کے ان شعروں کو محض تعلّی یا شاعرانہ

---

[1] کیمبرج کے مشہور پروفیسر براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا (تاریخ ادبِ ایران۔ جو بجا طور پر ایک قیمتی کٹلاگ کہے جانے کی مستحق ہے۔) بھی ایسی غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔ پروفیسر مرحوم ہمارے دوست تھے اور میں اُن کی عزت کرتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ (۱۹۲۵ء) جبکہ میں ولایت میں تھا میں نے انھیں سمجھا کر بہ شایستگی کہدیا کہ کسی قوم کا ایک بڑے سے بڑا فرد بھی کسی غیر قوم کے مذاق اور اس کے ادب کو اسوقت تک صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا جبتک وہ اُس قوم کے دامن میں پرورش نہ پا چکا ہو اس کمی کی وجہ سے نہ ہم یورپ کے ادب کی باریکیوں تک پہونچ سکتے اور نہ یورپین ہماری زبان و کلام کی نازکیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

شوخی سمجھو گے اور بس!

کچھ اور سنو۔ جنگ کربلا میں روز عاشور (حضرت) علیؑ اکبر کی رخصت ہے، امام حسینؑ کے سے باپ چشم پر آپ ہیں۔ بیٹے کو لے کر خیمہ میں، بہن (حضرت زینب) پاس جاتے اور رخصتِ اکبر کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ حضرت زینب نے (حضرت) علی اکبر کو اٹھارہ برس پالا اور جان کی طرح رکھا ہے۔ امام کا مطلب سمجھ کر ؎

بولی وہ عندلیب چمن پرور بتول | طرّہ وہی ہے سب پہ جھیسر چڑھے جو پھول
اے نخلِ باغِ فیض و گلِ گلشن رسُول | داغِ دلِ ریاضِ تمنا بدل حصول
شادی سدا نہیں چمن روزگار میں | روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

اے فرزند رسول۔ ہاں اکبر کی جدائی کا غم ہو گا۔ مگر ان کے ایسے عزم پر سب نثار۔ سہہ لوں گی۔ آج کی یہ قربانی تو ہماری چادر عزت کا طرّہ اور اس پھول سے مشابہ ہے جو جھیسر کے سر چڑھا ہو!

اب جبتک تم اپنی ملکی مذہبی روائتوں کو نہ جانو اور اُس ہندی ماتا کو نہ سمجھو جو اپنی عفت و عصمت کی بدولت دیبی بنیں اور پوجی گئیں، جنکی مُورتی جھیسر کہلائی اور اُس پر منت کے پھول چڑھنے اور مُرادوں کے گیندے

اترنے لگے، اس بیان کا کیا مطلب سمجھ سکتے اور کیونکر اس سے اثر لے سکتے ہو؟!

اتنے بڑے قصہ سے ہمارے یہاں تھیسر کے پھول کا سا نازک محاورہ پیدا ہو گیا۔ ان دیبی پر جو پھول چڑھتا اور اُن کے سر پر رہ جاتا وہ سب پر بالا (طرّہ) شمار ہوتا یہ ہمارا قدیم (ملکی و مذہبی) محاورہ، عصمت مآب حضرت زینبؑ کی زبان سے ادا کرا کے کس موقعہ پر یاد دلا دیا گیا۔ انیس کے اس تھیسر کو جانے بغیر، افصح عرب کی نواسی کا کلام تم نہیں سمجھ سکتے اور اسلئے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے!

اسی طرح شہنامہ کے جمشیدی جام اُسکی نوروزی صبح و شام اسکے ماہ و سال کی تقسیم اور پھر اُسکے جام جہاں نما کی سی تقویم۔ اور دَہاک (معرّب ضحاک) کے مار نما زخموں، زال و سی مرغ اور اسکے بخشے ہوئے اکسیری پروں کی تاثیر۔ رُستم اور اسکے ہفت خواں، اُسکے رخش (گھوڑے) اور سُہراب کے گلگوں (گھوڑا) کی ترک تازیوں اور اُن کے سواروں کی بگدھریوں اور پھر اُن جانداروں کے تُرکمانی کھیتوں[1] کی اصالتوں تک

[1] گھوڑے جہاں پیدا کرائے اور پرورش کئے جاتے ہیں اُس جگہ کو کھیت کہتے ہیں۔ اوائل نمبر

نہ پہونچے تو فردوسی کے بیانوں کو فسانہ کہدو گے اور اسی طرح اُس (فردوسی) کے
مے و مینا اور پھر اُسکے لطیف کنایوں، اشاروں، تشبیہوں، استعاروں،
تلمیحوں اور تاریخی عہد سے قبل کی ایرانی و چینی مائی تھولجیوں (مذہبی فسانے)
کے اندازوں اور ان کے بیان کے اسلوبوں اور لہجوں کو اگر نہ سمجھے تو اُس

(بقیہ صفہ) ترکمانوں نے تازیوں کی جاندار نسلیں پیدا کیں۔ اُن کے وہ اسپ، بادپا (ہوا پر اڑنے والے) بنے۔ رستم کا صبا رفتار سبزا رخش نام بھی اسی ترکمانی نسل کا اور حد کا جاندار و شیر کردار تھا یہ رخش ایک دفعہ چوری گیا۔ ترکمانی کھیتوں تک پہونچا۔ وہاں ایک گھوڑی سے جفت ہوا۔ اُسکا بچہ گلگوں کہلایا اور وہ رستم کے بیٹے سُہراب کی سواری میں آیا۔ جو لوگ اُن ترکمانی کھیتوں کی تاریخ اور وہاں کے اصیل گھوڑوں کی اصلیت کو نہیں جانتے وہ رخش و گلگوں کے طراروں کو بے تکلف مبالغہ کہدیں گے!

انیس پر بھی یہی ظلم ہوا۔ امام حسینؑ کی سواری کے جس گھوڑے کو وہ باندھتے ہیں اسکی اصل و نسل کو جانے بغیر، اُسکے آؤ جاؤ، اُسکی غیر معمولی چستیوں اور شیرانہ ہمہموں کی وجہ کو سمجھے بغیر، بخیر، اُسے ایک خیالی گھوڑا کہدیتے ہیں۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ آل رسول میں گھوڑوں کی خاص پردا ہوتی تھی۔ وہ سکھائے اور جنگوں کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ یہ گھر کے بچھیرے ہوتے اور لڑائیوں میں شیر ہو جاتے تھے۔ پھر فرزندان رسول کو سواری کے ہنر بھی بتائے جاتے اور جہاد میں وہ (ہنر) ظاہر ہوتے تھے!

شاد (عظیم آبادی) نے ہماری بخبریوں کو سمجھکر، اسی سے، اپنے مرثیہ میں، گھوڑے کا ذکر کیا اور کہا کہ ؎ زیر ران اسپ فلک مرتبہ، گھر کا پالا! — تاکہ لوگ باخبر ہو جائیں کہ اُس گھر کے گھوڑے کس کھیت کے تھے اور اسلئے وہ میدان جنگ میں کیا کر سکتے تھے؟!

کتابِ عجم کو کیا سمجھ سکتے ہو۔ اسی سے مردہ دماغ اُس زندہ کُن عجم کے جادُو قلم کی پُرکاریوں اور نازکیوں تک نہ پہونچ سکے اور اس کے نامہ سے حقیقی بات نکال نہ سکے اور اپنی بے بضاعتی سے شہنامہ کو محض فسانہ کہنے لگے۔ سنو۔ فردوسی کا یہ کارنامہ، فسانہ نہیں بلکہ اُسمیں وہ تاریخانہ انداز و بیان بھی ہے جس پر دُنیا کی تاریخ تحریر کی گئی۔ اور جبتک وہ ردّی نہ ہوں شاہنامہ رد نہیں کیا جا سکتا!!

شاہنامہ

ساسانیوں کے علم و دانش کی حکایتیں مشہور ہیں۔ آردشیر بابگاں (بانیٔ خاندان ساسانیاں) ہی کے زمانہ میں نئے علوم و فنون کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ سکندر کے بعد بھی یونان کا دروازہ ایرانیوں کے لئے کھلا رہا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کی حکمت زمین عجم پر بھی اپنا اثر ڈال رہی اور اس قدیم ملک میں جدید راہیں نکال رہی تھی۔ اس (اردشیر) کے جانشین شاہ پور نے ملک کو اور ترقی دی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور کسریٰ یعنی نوشیرواں کے وقت (۵۰۰ء) کا ایران، قدیم ہندوستان و یونان سے کسی طرح

کم نہ تھا۔ کرؔل بروکلمین (Carl Brockel man) اپنی مشہور تصنیف (Geschichte D. Arabic Literature) میں لکھتے ہیں۔ کہ

ایک عرصہ سے ایران پر شامی و یونانی کلچر کا اثر پڑ رہا تھا۔ نوشیرواں کے عہد میں وہ اثر تیز ہو گیا۔ اُس بادشاہ نے صوبۂ خوزستان کے مشہور شہر گندشاہ پور میں ایک یونیورسٹی قائم کی جہاں فلسفہ، منطق اور دیگر علوم و فنون کے ساتھ طب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ دارالعلوم عباسیوں کے زمانہ تک قائم تھا۔ (جلد ۱ صفحہ ۲۰۱)

نوشیرواں، تاریخ کا مذاق بھی یونانؔ سے لایا۔ اسے تاریخ عجم کے لکھے جانے کا شوق ہوا۔ مختلف صُوبہ جات کے حاکموں کو حکم ہوا کہ وہاں کے قدیم حالات قلمبند کر لئے جائیں۔ فرمان کی تعمیل ہوئی۔ چار طرف سے نوشتے آنے اور شاہی خزانے میں جمع ہونے لگے (طبری و مسعودی) نوشیرواں کے بعد مدائن کے ایک دانشور دہقان[1] نے اُن مسوّدوں کو معہ فہرست ترتیب دے کر شاہی حکم سے محفوظ کر دیا (طبری)، اسی دہقان کی نسبت فردوسی کہتا ہے ؎

[1] دہقان۔ قدیم فارسی محاورہ میں بزرگ اور چودھری کو کہتے ہیں جیسے انگریزی میں اسکوائر (Esquire)

یکے پہلواں[1] بود دہقاں نژاد　　دلیر و بزرگ و خردمند و باد
پژوہیدۂ روزگارِ نخست　　گذشتہ سخن ہا ہمہ باز جست

ہمارے نبی عربیؐ نے دُنیا سے قومیت کے اختلاف کو دُور کرنے کی کوشش فرمائی۔ ایک مسلمان، وہ عرب ہو یا غیر عرب، اسلام کی نظر میں یکساں درجہ رکھتا اور مُساوات، کا حقدار و سزاوار تھا اسی بنا پر عرب آکر اور سیّد عرب پاس حاضر ہوکر، نہ بلالؓ، حبشی باقی رہے اور نہ سلمانؓ، فارسی۔ وہ صرف مسلمان سمجھے گئے اور گھر والوں کی طرح ان سے سلوک کیا گیا۔ اور فارس کی شہزادی (شہر بانو) شہزادۂ عرب (امام حسینؑ) کے محل میں کنیز ہو کر نہیں ملکہ و مالکہ، بن کر رہی اور ائمۂ اہل بیت کی بزرگ و مادر مہرباں سمجھی گئی۔ اور اُن کی اولاد سلطان العرب والعجم، کہی گئی۔

جنگ ایران کے ختم ہوتے ہی دار الخلافت مدینہ میں، ایرانی، عربوں کے دوش بدوش اور ہم پلہ نظر آنے لگے۔ اُن کے علم و دانش، شائستگی

[1] پہلوان۔ فردوسی کے یہاں پہلوان کا لفظ بڑے اور عالی مرتبہ کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے انگریزی میں نائٹ (Knight) اس دہقان و پہلوان کی یہ تاریخ عجم شاہنامہ تصنیف کرتے وقت فردوسی کے پیش نظر رہی ہے۔

اور تجربات حکمرانی سے فائدے حاصل کئے گئے۔ سرکاری محکموں میں وہ سر دفتر دکھائی دینے لگے اور صیغہ مالگذاری (ریونیو) کے افسر بن گئے۔ فارسی زبان اور فارسی حرفوں کو حکومت کے اکثر محکموں میں جگہ دی گئی اور یوں ایک مفتوح قوم کی عزت کی گئی (فخری) یہی نہیں بلکہ اُن کی گذشتہ تاریخ بھی عظمت کی نظروں سے دیکھی گئی۔ ساسانیوں کی تباہی پر شاہی خزانے سے جو جواہر نکلے اُنمیں وہ بیش بہا نوشتہ جات بھی تھے۔ جنھیں نوشیرواں نے محفوظ کر دیا تھا۔ وہ بھی دربار خلافت تک پہنچائے گئے۔ مترجم طلب ہوئے۔ ترجمہ سنا گیا۔ پسند آیا اور وہ امانۃً بیت المال میں رکھدیا گیا۔ (طبری و مسعودی)

ایسے سلوک و مدارا سے عرب و عجم کا دیرینہ اختلاف کم ہو رہا اور وہ وقت آرہا تھا کہ دونوں قومیں خودی کو بھول کر، صرف مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہیں اور اسلام کی خدمت کریں۔ مگر ایسے مبارک زمانہ کی عمر پچاس ساٹھ سال سے زیادہ نہ ہونے پائی۔ شام میں سلطنت و خلافت کا قائم ہونا اور اسکے زور کا بڑھنا تھا کہ اسلام کے جہاں اور اصول میں فرق آیا وہاں مُساوات، کا سا اصول بھی فراموش ہونے لگا۔

عبدالملک[1] (بن مروان) نے عربوں اور غیر عربوں اور خصوصاً ایرانیوں میں تفریق کی بنا ڈالی اور ایام جاہلیت کی یاد تازہ کردی۔ ایرانی، سرکاری محکموں سے اور فارسی دفتروں سے خارج ہو گئی۔ دربار کے حکم سے جب صالح نام ایک افسر صیغہ نے اپنے دفتر سے فارسی کو خارج کیا تو عجمی برہم ہو کر بے اختیار کہہ اُٹھے۔ کہ۔ خدا تیری اصل و نسل کو بھی اسی طرح برباد کرے جسطرح تو نے ہماری زبان کی جڑ کاٹی! (بلاذری)

ایسی غیر اسلامی روش سے، عرب و عجم کا دیرینہ اختلاف اور ان کا تصادم پھر شروع ہو گیا۔ ابو مسلم خراسانی کا علم اسی پالیسی کی بدولت بلند ہوا۔ اموی گرے اور عباسی کھڑے ہو گئے۔ گذشتہ واقعات پر نظر کر کے اُنھوں (عباسی) نے خود کو مضبوط کرنا چاہا۔ اس لئے اپنے گرد و پیش ایرانیوں کو جمع کر لیا۔ لیکن یہ طریقہ بھی درست نہ تھا۔ اسلام کے اصول کو مدِ نظر رکھ کر، عباسیوں نے عرب و عجم کی تفریق نہیں مٹائی بلکہ اپنے مفاد کے لئے ایک قوم کو دوسری قوم کی جگہ دیکر آتش قومیت

[1] عبدالملک کو جس وقت اسکے خلیفہ ہونے کا مژدہ ملا وہ تلاوت کر رہا تھا۔ یہ سُنکر فوراً اُس نے کلام اللہ کو بیچ کیا اور کہا ھذا فراق بینی و بینک۔ یعنی آج سے تجھے سلام! (فخری)

کو اور ہوا دیدی اور اُس کے شعلوں میں آخر وہ خود محصور ہو گئے!

منصور (عباسی) کے وقت میں برمکی[1]، حکومت و خلافت پر قابض رہے تو مامون کے زمانے میں طاہر[2] و طاہری سلطنت کے شریک ہو گئے۔ اس شرکت نے ایرانیوں کے حوصلے بلند کر دئے وہ اب اپنے بل پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ طاہریوں کے بعد یعقوب لیث (۲۶۴ھ = ۸۷۷ء) کا دَور دَورا ہوا۔ یہ سیستانی تھا، وطن دوست و قوم پرور اپنے گذشتہ کارناموں کو یاد دلا کر وہ ایرانیوں کے قومی احساس کو تیز کرنے لگا۔ نوشیرواں کی جمع کردہ تاریخ عجم، اسی کے حکم سے، پہلوی سے، اسوقت کی فارسی میں ترجمہ ہوئی۔ ابو منصور عبد الرزاق نے خسرو پرویز اور یزدگرد کے حالات اور فارسیوں پر تازیوں کی چڑھائی کی واردات اسمیں اضافہ کر کے اس نسخہ کو مکمل کر دیا۔ اور وہ داخل[3] خزانہ ہو گیا۔

---

[1] برمک۔ آتش کدہ کے محافظ کا خطاب ہے۔ یہ خاندان آتشکدۂ نوبہار (علاقہ بلخ) کا محافظ اور زردشتی تھا۔ بعد کو مسلمان ہوا۔

[2] طاہر (۸۲۰ء) بھی خالص ایرانی تھا اسکے اور یعقوب لیث کے زمانہ میں ایران کا ایک حصہ خود مختار ہوا۔

[3] مسعودی (چوتھی صدی ہجری) ناقل ہے کہ بُستان نامہ جو ساسانیوں کے وقت میں (باقی بر ۱۷)

اسمٰعیل سامانی نے آل یعقوب (لیث) کا خاتمہ کیا اور اب (۲۸۸ھ) ایران[۱] سامانیوں اور دیلمیوں میں تقسیم ہو گیا۔ آل یعقوب کی ملکیت بھی ان دو خاندانوں (سامانی و دیلمی) میں حصہ ہو گئی۔ سامانی اُس وقت مشرقِ ایران پر قابض تھے، اور دیلمی مغربی ایران کے مالک اور عراق میں اثر رکھتے تھے ان دونوں خاندانوں کی رقابتیں مشہور ہیں۔ ایک دوسرے کو زیر کرنا اور بات بات میں سبقت لیجانا چاہتا تھا۔ دیلمی اور سامانی دونوں وطن دوست تھے۔ اور قوم پرست۔ اُن کی آرزو تھی کہ اُن کے ملک کا گمشدہ وقار پھر حاصل ہو اور ایرانی دوبارہ بلند نام ہو جائیں۔ تاریخ عجم کو عام کیے بغیر یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے اُس کی نئی ترتیب میں حد کی کوشش کی۔ لیکن دیلمیوں سے قبل، سامانی اس کام کی طرف متوجہ ہوئے اور آخر شاہنامہ اُن کے زمانہ۔ کا۔ ایک کارنامہ بن گیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۶) تحریر ہوا وہ اصطخر کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ یہ نامہ بعد کو (۱۱۳ھ) اسوقت کی فارسی میں ترجمہ ہوا۔ مسعودی نے اصل اور ترجمہ دونوں کو دیکھا۔ یہ نامہ بھی فردوسی کے زیر مطالعہ رہا ہے۔

[۱] سامانی بہرام چوبین کی اولاد تھے اور دیلمی بہرام گور کے۔ اسلئے دونوں خالص ایرانی تھے۔

آمیر نصر (سامانی) وہ مشہور سلطان ہے جسکے دربار میں رودکی نے بار پایا۔ اور سلطان نوح اس خاندان کا وہ امیر ہے، دقیقی[۱] جس کے در دولت سے فیضیاب رہا۔ سلطان کی فرمائش پر اس دقیقی نے اُس وقت کے مذاق کے موافق۔ تاریخ عجم کو نظم کا جامہ پہنایا۔ لیکن وہ ابھی شاہ گشتاسپ اور آشو زردشت کا حال اور صرف ہزار بیت لکھنے پایا تھا کہ اپنے ایک غلام کے ہاتھ سے مارا گیا اور شاہنامہ ناتمام رہ گیا۔

الپتگین و سبکتگیں اسی خاندان (سامان) کے وہ خوش خرید غلام ہیں جو اُس کے فرزند بنے رہے اور محمود (سلطان) اس گھر کا وہ چراغ ہے جو غزنی ہی نہیں بلکہ دُنیا میں لعل بدخشاں کی طرح روشن رہا۔ محمود سامانیو کے سے قوم پرست و ادب دوست خاندان میں پلا تھا۔ یہ چیزیں اس کے خون میں سرائت کئے ہوئے تھیں۔ یہ سلطان ہوا تو اور لوازمات سلطانی کے ساتھ اپنے آسمانی دربار کو بھی ان ادیبوں اور شاعروں سے اُس نے سجایا جو اسکے سبعۂ سیارہ کہلائے۔ تاریخ عجم کو منظّم کرانے کا شوق وہ

---

[۱] دقیقی (۹۷۶-۹۷) کی نسبت مشہور ہے کہ وہ زردشتی تھا۔ اس کا نام احمد منصور ابن احمد دقیقی ہے۔ اسوقت ایسے عربی نام، غیر مسلموں میں بھی عام تھے!

سامانیوں کے گھر سے لایا تھا۔ دقیقی کا حال اسے معلوم تھا۔
سامانیوں کے اس ادھورے کام کو یہ اب پورا کر دینا چاہتا تھا۔ اپنے
درباری شعرا آخرمی وغیرہ کو اس نے حکم دیا کہ شاہان عجم کی داستانیں نظم کریں
وہ مشغول ہو گئے اور سلطان بے فکر ہو گیا۔!!
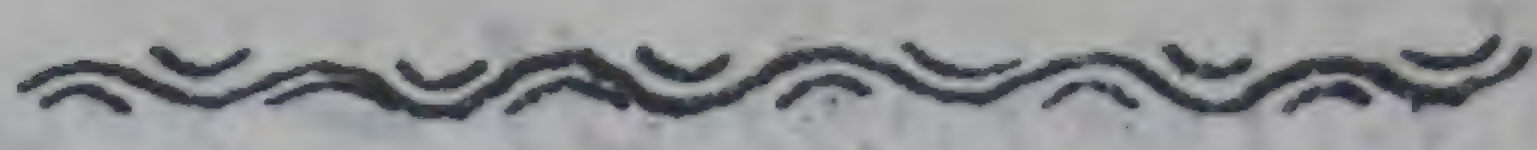
شاہنامہ کی تکمیل

فردوسی وہاں اپنے وطن (طوس) میں بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ مشک کی خوشبو چھپتی نہیں۔ ہوا لے اڑی۔ وطن پر بیرونی یعنی تازی حملہ کی داستان اور ضحاک و فریدوں کے حال تک پہنچا تھا کہ شہرت ہو گئی۔ وطن پرست عجمی جوق جوق اسکے در تک کھچ آتے، داستان سُن سُن کر، عش عش کرتے اور سر دُھنتے۔ اس وقت کے والی طوس ابو منصور تک بھی یہ خبر پہنچی۔ اس نے فردوسی کو یاد کیا۔ داستان سُنی۔ فریفتہ ہو گیا۔ فرمائش کی کہ یہ کام آگے بڑھے۔ فردوسی اس واقعہ اور ابو منصور کے متعلق شاہنامہ میں یوں اشارہ کرتا ہے ؎

بداں نامہ چوں دست کردم دراز | یکے مہترے بود گردن فراز
مرا گفت کز من چہ آید ہمی | کہ جانت سخن ہر گر آید ہمی

منصور کی ہمت افزائی سے کام جاری تھا کہ وہ مر گیا۔ شاعر متاثر ہوا۔ کہتا ہے کہ ؎

یکے نامور گم شد از انجمن　　　　چو از باد سرو سہی در چمن

فردوسی اداس بلکہ دل شکستہ ہے، مگر فطرت اُبھار رہی اور دل بڑھا رہی ہے۔ داستان ابھی پوری نہیں ہوئی کہ لوگوں کی زبان پر آجاتی ہے۔ اتنے میں ارسلان خاں حاکم طوس ہوا۔ اس شاہنامہ کے ترتیب و تنظیم کی خبر آگے بڑھ چکی اور سلطان محمود تک پہونچ چکی تھی۔ وہ مشتاق ہوا۔ اور ارسلان[1] خاں کے ذریعہ سے طلب کیا گیا۔!

دیلمی اب بھی مغرب ایران کے حاکم ہیں۔ سامانی محمود اور ان سے خاندانی چشمک ہے۔ دیلمی، فردوسی کے قدردان و سرپرست ہیں۔ محمود اپنے قدیم رقیبوں تک اسے جانے سے بہ ہوشیاری روکتا ہے کہ ان تک رسائی ہوئی تو اسکی یہ نظم دیلمیوں سے منسوب ہو جائیگی۔ اسلئے فردوسی کو اور جلد یاد کرتا ہے کہ وہ غزنی آئے اور شاہنامہ ختم ہو کر یہ کارنامہ اس کے نام سے معنون ہو جائے!!

وہ غزنی آیا۔ سلطان خوش ہوا۔ درباری شعرا طلب ہوئے۔ ان کی

[1] مؤرخوں میں اختلاف ہے کہ فردوسی سلطان تک کس طرح پہونچا۔ بہرکیف اسکا غزنی جانا اور وہاں رہنا ثابت ہے اس سے زیادہ کرید کی ضرورت نہیں۔

داستان سنی گئی۔ پسند نہ آئی۔ پھر فردوسی کو سُنا۔ فرمایا کہ۔ یہ اور چیز ہے۔[1] شاہنامہ کی تکمیل کا حکم ہوا۔[2] شاہی محل کے پاس اسے جگہ دی گئی۔ یہ مکان شاہان ترک و عجم کی تصویروں، ان کے ہتھیاروں، سواریوں اور لشکریوں کے مرقعوں سے آراستہ کردیا گیا۔ تاریخ عجم کے وہ نسخے جو آل یعقوب کے خزانہ سے سامانیوں کے ہاتھ لگے تھے وہاں رکھ دئے گئے اور وہ شاہی مہمان بنکر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

فردوسی نے اپنا کارنامہ غزنی میں ختم کیا۔ یہ فخر اور حق کہتا ہے

عجم زندہ کردم بدیں پارسی!

وہ مسیح عجم، زمانہ کے مزاج سے واقف اور شاید اپنے جام جہاں نما میں ہمارے دَور کا نقشہ دیکھ لیتا ہے کہ بعد کو ایسے ایسے خوش مذاق بھی پیدا ہوں گے جو اس کے شاہنامہ کو فسانہ کہدیں گے۔ یہ سمجھ کر وہ اپنا نامہ شروع کرتے وقت بسم اللہ کے بعد کہتا ہے

---

[1] آتشکدہ اور تذکرہ دولت شاہ۔

[2] فردوسی، طوس سے غزنی اسوقت آیا جبکہ وہ ادھیڑ تھا۔ اور شاہنامہ وہ شروع جوانی میں شروع کرچکا تھا اور اسمیں بھی اپنے استاد آسدی سے سبق لیتا رہا۔

تو این را دروغ و فسانہ مداں   بہ یکساں روشں درزمانہ مداں
ازو ہرچہ اندر خورد با خرد   وگر بررہ رمز و معنے بُرد

یعنی جو تحریر ہوا وہ محض کہانی نہ سمجھا جائے۔ اس میں حقیقتیں ہیں اور انھیں عقلمند و عالم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عامی ان رمزوں کو کیا جانیں۔

شاہنامہ کا اثر

فردوسی نے اپنا نامہ طُوس میں شروع کیا۔ یہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وہ غزنی آیا۔ سلطان (محمود) پاس رہنے کے بعد بھی وہ آزاد رہا۔ اس کا کلام اب بھی شہروں شہروں سوغات کی طرح جاتا اور ‍‍ پڑھا اور زبان زد ہوتا رہا۔ رستم و اسفندیار کی داستان اُس نے لکھی، تو اتنی مرغوب ہوئی کہ فخر الدولہ دیلمی نے ایک ہزار دینار اُسے بہ طور صلہ بھیجا۔ اسی طرح اطراف سے فتوحات آتے اور فردوسی کو خوش کرتے۔ محمود کو یہ خبریں ملتیں اور ناگوار گذرتیں۔ سلطان اپنے رقیبوں (دیلمیوں) کے ساتھ، فردوسی کا ایسا ربط ضبط دیکھ کر اس سے کشیدہ رہا۔ شاہنامہ کا صلہ (جس کا وہ مستحق تھا) آخر اُسے نہ ملا اور وہ خالی ہاتھ غزنی سے چلا اور شمال کیطرف بڑھا۔

مذہب نے سیاست کے پردے میں اور سیاست نے مذہب کی آڑ میں جو گل کھلائے ہیں وہ دُنیا کی تاریخ کے یادگار اور خونی باب ہیں۔ محمودؔ کے وقت میں بھی ایسے گل خوب خوب کھلے۔ مذہب کے نام سے جہاں دوسرے ملکوں پر چڑھائیاں کی گئیں اور خلاف شریعت جبکہ بے قصوروں کی گردن کُشیاں کی گئیں، وہاں کسی ایک فرد پر عتاب کیا بڑی چیز ہے ؟! ۔ساؔمانیوں اور دیلمیوں کا اختلاف اور ان کی رقابتیں مشہور ہیں۔ ایک دوسرے پر گو صاف صاف حملہ نہیں کرتے تھے مگر پردے پردے میں بہت کچھ ہو جاتا تھا۔ دیلمیوں سے فردوسی کا یوں خلط ملط، واقعی سلطان کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ مگر سیاسی وجوہات سے اسکا ظاہر کرنا خلاف مصلحت تھا اسلئے اگر محمود نے فردوسی کے عقاید کو اس سے نفرت کا ایک بہانہ بنایا ہو تو تعجب کی کیا بات ہے ! اسلام کا درد نہ محمودؔ اور محمودیوں کے سینوں میں تھا اور نہ دیلمیوں کے دلوں میں۔ ورنہ خلاف مذہب وہ خونریزیاں نہ ہوتیں جن کے ذکر سے ہماری تاریخ کے ورق رنگیں نظر آتے ہیں۔ اسلئے فردوسی کو اس کا صلہ نہ ملنے پر صرف مذہب کو بیچ میں لانا ان کا کام ہے جو اسوقت کے مذاق اور اس عہد کی تاریخ کو بھول جاتے ہیں !

ے زغزنی چو فردوسی آمد بروں

از انجا بہ مازندراں شد دروں (مرزبان نامہ)

یہاں وہ اپنے پرانے دوستوں اور مربیوں سے ملا۔ اور اب ے

بہ اصلاح شہنامہ کرد او بسیچ ز حشو اندروں نگذاشت ہیچ

والی مازندران (دیلمی) کو اُس کی آمد کی خبر ہوئی۔ فردوسی سے ملا۔ اس کی خاطریں کیں۔ مگر کہا کہ۔ سلطان ہمارا مخالف ہے۔ یہاں زیادہ قیام درست نہیں۔ بغداد کی طرف رُخ کرنا مناسب ہے وہاں امن ملے گا۔ فردوسی نے یہ صلاح پسند کی۔ بغداد چلا گیا۔ اور ے

در انجا درخت اقامت نشاند

خلیفہ تک رسائی ہوئی۔ اُس کے علم و کمال کی قدر کی گئی۔ مگر، زندہ کن عجم، عربی دربار میں زیادہ بار کیونکر پاتا؟ لیکن شاعر کی سوز بانیں اور ہزار قلم۔ اُس نے خلیفہ کی شان میں قصائد کے انبار لگا دئے۔ وہ بھائے اور فردوسی نے خاطر خواہ صلے پائے۔

ابوالقاسم مازندران سے ہو کر اور دیلمیوں سے مل کر بغداد گیا تھا۔ اُسوقت ایک طرف یہ دیلمی اور دوسری طرف سامانی (یعنی محمود) دربار خلافت کو اپنے

زیر اثر رکھنا چاہتے تھے۔ سلطان کو فردوسی کے بغداد جانے کی خبر ہوئی تو اُسے خدشہ ہوا۔ فردوسی کو دیلمیوں کا ایلچی سمجھ کر تاب نہ لایا اور اپنے خلیفہ کو ایک تہدیدی خط لکھا۔ تحریر کیا کہ ہمارے دشمنوں (دیلمیوں) کا اگر پاس کیا گیا تو غزنی کے پرشکوہ ہاتھی بغداد کو روند ڈالیں گے! خلیفہ، خط پڑھ کر مسکرایا۔ حکم دیا کہ۔ اس کے جواب میں، اَلَم (الف، لام، میم) اور والسّلام لکھ کر قاصد کے حوالہ کردیا جائے! سلطان کو یہ جواب ملا تو اَلَم تَرَ کَیفَ (سُورہ فیل) کی سُورۃ کو یاد کر کے خموش ہو رہا۔

اپنے چہار مقالہ میں ابن اسفندیار کہتا ہے کہ۔

فردوسی دل برخاستہ ہو کر غزنی سے چلا اور تبرستان (طبرستان) پہنچا تو اُس وقت شہریار نام خاندانِ یزدگرد کا ایک شہزادہ وہاں کا والی تھا۔ فردوسی نے اپنا نامہ یہ کہکر اُسے دیا کہ یہ شاہانِ ایران کا کارنامہ ہے، اسے تمھارے نام سے منسوب ہونا چاہیئے۔ اور پھر محمود کا قصّہ سنایا۔ شہریار نے کہا کہ۔ سلطان کو تمھاری نسبت غلط خبریں

---

[1] بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ شہریار والیٔ طبرستان (جہاں فردوسی، غزنی سے جاکر روپوش تھا) کے ساتھ پیش آیا۔ مگر افضلیت پہلی حکایت کو ہے۔

پہونچی ہیں۔ اُسے جب صحیح اطلاع ہوگی تو غم وغصہ دُور ہو جائیگا۔ اپنی محنت رائگاں نہ کرو۔ یہ شاہنامہ محمود ہی کے نام سے رہے تو اسکی قدر و منزلت بڑھے گی۔ یہ کہکر اُس نے فردوسی سے وہ ہجو لے لی جو اُس نے رنج ہو کر سلطان کے خلاف لکھی تھی ؎

(کہ شاعر چو رنجد بہ گوید ہجا)

اور اُسے ضائع کردینا چاہا۔ مگر فردوسی نے خود کہا تھا کہ ؎

ہجا تا قیامت بہ ماند بجا

وہ مٹتا کیونکر؟ صفحہ روزگار پر وہ بھی رہ گیا اور بچہ بچہ کی زبان پر آگیا۔" فردوسی، بغداد سے رخصت ہو کر سفر کرتا پھر وطن (طوس) آیا۔ رستہ میں

لہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ مشہور ہجو۔ فردوسی کی نہیں ہے۔ اسلئے کہ اُس کی، ذات ایسے لغویات سے بالاتر تھی۔ فردوسی کے مدّاح ایسے حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ۔ شاعر اگر اپنے واردات قلبی کے اظہار میں گویا نہ ہو تو وہ شاعر نہیں کچھ اور ہے۔ فردوسی سے محمود نے جو سلوک کیا وہ اُس کے لئے سخت رنج دہ تھا اور چونکہ وہ فطری شاعر تھا اسلئے اپنے اس جذبہ کو بھی اُس نے نظم کر ڈالا۔ اسمیں عیب کیا ہے۔ بلکہ اگر وہ اپنے غم و غصہ کو پوشیدہ رکھتا تو شاعر نہ سمجھا جاتا۔ ہاں اُس نے ذرا احتیاط کی اور محمود کی شان میں صرف وہ باتیں کہیں جو حق تھیں اور اسلئے وہ مٹائے نہ مٹیں۔

اپنے اشعار سنتا اور بالیدہ ہوتا۔ ایک دن طوس کے بازار میں اُس نے چند لڑکوں کو کھیلتے اور ؎

اگر شاہ را شاہ بودے پدر　　بسر بر نہادے مرا تاج زر

اور ؎　　اگر مادرِ شاہ بانو بُدے

مرا سیم و زر تا بزانو بُدے

جوشوں میں پڑھتے سُنا۔ دل بھر آیا۔ کہا کہ اپنی زندگی میں ہم نے اپنی مشقت کی داد پالی۔ اور صلہ درکار نہیں!

اس طرح اُس کا کلام عام اور شہنامہ عوام تک کی زبان پر جاری تھا اور اُس سے ایرانیوں کے دل و دماغ میں سکت آرہی اور ان کے مردہ دلوں میں وہ روح (اسپرٹ) بھر رہی تھی جو قوموں کی اصل جان اور ان کی غلامی سے نکلنے کی پہچان ہے۔

فردوسی کے غزنی سے جانے کے بعد بھی محمود کا دربار اس کے اشعار سے گونجتا اور بڑے کام دیتا رہا۔ نظامی سمرقندی کہتے ہیں۔ کہ

محمود، ایک دفعہ، ہندوستان سے واپس آرہا اور غزنی سے قریب تھا کہ رستہ کے ایک قلعہ کا سردار باغی ہوگیا۔ سلطان قلعہ کے

دروازہ پر خیمہ زن ہو گیا۔ قاصد طلب ہوا کہ قلعہ دار کو جا کر حکم سنائے کہ صبح وہ حاضر ہو۔ آیا تو سرفراز ہو گا ورنہ سزایاب ہو گا۔ سلطان پاس اُس وقت وزرا حاضر تھے اور وہ ایلچی بھی موجود تھا۔ بادشاہ نے وزیروں سے پوچھا کہ۔ ہاں، قلعہ دار کو کیا حکم جائے گا؟ ایک وزیر نے عرض کی کہ۔ وُہی ؎

اگر جز بہ کام من آید جواب　　من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان یہ سنکر سوچ میں گیا۔ پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ عرض ہوئی کہ اُسی کمبخت کا جسے ابوالقاسم کہتے ہیں! محمود خوش ہو گیا پھر کہا کہ۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ ایک ایسا لائق شخص ہمارے دربار سے یوں محروم ہو گیا۔ اچھا غزنی پہونچ کر مجھے اس کی نسبت یاد دلانا!

نظامی پھر کہتے ہیں کہ۔

غزنی میں سلطان کی خدمت میں فردوسی کے متعلق عرض کی گئی۔ حکم ہوا کہ۔ ساٹھ ہزار دینار کی قیمت کا نیل سرکاری اونٹوں پر بار کر کے طوس بھیجدیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں دیر ہوئی۔ وہ

اونٹ تبران (طبران، طوس کا وہ مقام جہاں فردوسی رہتا تھا) کے دروازہ رود بار پر اسوقت پہنچے جبکہ شہر کے دوسرے دروازہ رآضان سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔

سخت افسوس کے ساتھ وہ اونٹ، فردوسی کی بیٹی کے پاس پہنچائے گئے کہ وہی اسکی ایک وارث تھی۔ لیکن اُس غیور نے شاہی عطیہ کے لینے سے اسلئے انکار کیا کہ اس کا باپ اس صلہ سے محروم گیا! آخر اُس نیل کی قیمت کے روپے سے نیشاپور کی ایک سرائے (چاہا نام) مرمّت کر دی گئی۔

قوموں کے سُدھارنے اور بگاڑنے میں قلم نے ہمیشہ بڑے کام کئے ہیں یہ تلوار سے تیز تر اور مذہبی و ملکی قانون سے زیادہ زور آور رہا ہے۔ تلوار ڈرا سکتی اور قانون دھمکا سکتا ہے۔ ہماری ذہنیت نہیں بدل سکتا مگر ادب، ملک و قوم کے دماغ و مزاج کو پھیر دے سکتا ہے۔ عرب بھی تلوار کے نہیں، ادب ہی کے زخمی ہیں۔ قرآن نے اُن کے دلوں کو موہ لیا۔ زبان کی سنان اُن کے جگر میں پیوست ہوئی۔ وہ اپنی چرب زبانی بھولے اور اُسکے ادب کے آگے سجدہ کرنے لگے!

ہر زبان کے صحیح ادب نے اپنے ملک و قوم میں ہیجان ڈالا اور انھیں اٹھایا ہے اور اگر کوئی ادب (وہ نثر ہو یا نظم) انسان کو آگے نہ بڑھائے تو وہ فضول و بیکار ہے۔ اور جو ادب ملکوں اور قوموں کو سُلائے وہ بے ادب اور وہ زہر ہے جسے دریا بُرد کرنا اور ؎

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

ہونا چاہیئے۔

فارسی شاعروں میں رودکی وہ مشہور شاعر ہے۔ جس کی ایک نظم نے سلطان امیر نصر سامانی پر ایک دفعہ خاص اثر ڈالا کہتے ہیں کہ۔ امیر مدت سے، اپنا وطن بخارا چھوڑ کر، ہرات میں مقیم تھا۔ لشکری تنگ اور اپنے گھر کو یاد کرتے تھے۔ انھوں نے رودکی سے کہا کہ کسی طرح امیر کو اُبھار کر، بخارا لے جائیے۔ رودکی۔ درباری شاعر اور سلطان کا ندیم تھا۔ اس نے ایک نظم لکھی جسکے چند شعر یہ ہیں ؎

بوئے یار مہرباں آید ہمی	یاد جوئے مولیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و شاد زی	شاہ سویت میہماں آید ہمی
شاہ ماہ است و بخارا آسمان	ماہ سوئے آسمان آید ہمی

شاہ سرو است وبخارا بوستاں　　سرو سوئے بوستاں آید ہمی

نظام الملک عروضی کہتا ہے کہ شب کو جس وقت رودکی نے یہ اشعار ترنم کے ساتھ سلطان کے سامنے پڑھے تو دربار جھومنے لگا اور امیر کو اس وقت اپنے وطن بخارا کی یوں یاد آئی کہ وہ تخت سے کود کر اپنے گھوڑے پر جا بیٹھا۔ جوشوں میں اُسے ایڑ لگائی۔ اور ہوا کی طرح بخارا کی طرف چلا اور کئی منزل کے بعد دم لیا!

فردوسی نے بھی اپنے اسی زور زبان سے میدان جیتے ہیں۔ اسکی زندگی کی حکایتیں تو عام ہیں، مگر اسکے نو سو برس بعد کا ایک قصہ سنو اور شاہنامہ کے اثر پر نظر کرو۔ صاحب ناسخ التواریخ ناقل ہیں کہ۔

"شاہان ایران کے دربار میں شاہنامہ کے پڑھے جانے کا خاص رواج تھا اور قاچاریوں میں بھی یہ دستور جاری رہا۔ فتح علی شاہ کے وقت میں روسیوں کا زور رہا۔ جنگ چھڑی۔ ایک شاہزادہ لڑائی پر بھیجا گیا۔ ایرانی شکستیں کھاتے تھے اور ضروری مقام کسی طرح سر نہ ہوتا تھا۔ شہزادہ تھک کر اپنے خیمہ میں آ بیٹھا۔ دستور کے مطابق اس کے سامنے شاہنامہ پڑھا جانے لگا۔ داستان سرا،

پڑھتے پڑھتے جب رستم و افراسیاب کی جنگ کے موقعہ پر پہونچا اور شب کی ایک صحبت میں رستم کی زبان سے للکار کر اس نے یہ شعر پڑھے کہ ؎

چو فردا بر آید بلند آفتاب — من و گرز و میدان و افراسیاب

چنانش بکوبم زگرز گران — چو پولاد کو بند آہن گران

تو شہزادہ بے اختیار جوشوں میں کھڑا ہو گیا۔ خیمہ سے اُبلی تلوار لئے نکلا، گھوڑے پر بیٹھا، حملہ کا حکم دیا۔ فوج نکلی، بڑھی، دشمنوں پر جا پڑی اور روسیوں سے، اس مقام کو لے پڑی، !

شاہنامہ کا پہلا سبق

اگر سوال ہو کہ فردوسی نے ہم کو کیا دیا ؟ تو شاہنامہ کا حافظ، فریدوں کے فرزند ایرج کی حکایت پیش کر دے گا۔ فریدوں کے تین بیٹے تھے۔ سلم، تور اور چھوٹا ایرج۔ بادشاہ نے اپنے ملک کے تین حصے کئے۔ بلخ اور اُدھر (مشرقی شمال)، کا کل علاقہ سلم اور تور کو دیا جو بعد کو توران کہا گیا۔ اور ملک کا مغربی حصہ ایرج کو بخشا جو اس کے نام سے ایران[1] مشہور ہوا۔ سلم

[1] ایران کے حاشیہ کیلئے صفحہ ۴۴ ملاحظہ ہو۔

اور تُور کو یہ تقسیم بُری لگی اسلئے کہ ایرج نے ملک کا جو حصّہ پایا وہ آباد اور زرخیز تھا۔ اُنھوں نے باپ (بادشاہ) سے اسکی شکایت کی۔ فریدوں کو بیٹوں کی ایسی سرتابی بُری معلوم ہوئی۔ مگر ایرج نے بادشاہ کو سمجھایا اور عرض کی کہ مجھے اجازت ہو۔ میں بھائیوں کو سمجھانے جاؤں، فریدوں نے یہ رائے پسند کی اور بیٹے کو رخصت کیا۔

ایرج بھائیوں تک پہونچا۔ خُردانہ ملا۔ بہت کچھ عرض و معروض کی۔ مگر سلم و تُور کا غصّہ نہ اُترا، اور وہ ایرج کے مار ڈالنے پر کھڑے ہو گئے دونوں نے اُس پر حملہ کیا۔ ایرج نے سر جھکا دیا اور کہا کہ ؎

بہ خونِ برادر چہ بندی کمر	چہ سوزی دل پیر گشتہ پدر
پسندی و ہم داستانی کنی	کہ جاں داری و جانستانی کنی
میازار مورے کہ دانہ کش ست	کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش ست

اس پر بھی وہ باز نہ آئے۔ ایرج کو قتل کر کے اس کا سر فریدوں کو بھیجدیا۔ شاہنامہ نام ہے ایرانی اور تورانی جنگ کا۔ اور ان کی یہ جنگ مظلوم

(حاشیہ صـــ۳۳) ایران۔ کہتے ہیں کہ لفظ ایرج کی جیم، کثرت استعمال سے نون بنی۔ وہ اِیرن ہوا اور بعد کو ایران۔

ایرج کے قتل سے شروع ہوتی ہے۔ وہ معلم فارسی (فردوسی) پہلے خون ناحق کو مذموم بتاتا اور آیرج کی زبان سے حکیمانہ و برادرانہ نصیحت کراتا اور انسانیت کا سبق دیتا ہے جس پر یہ دُنیا قائم ہے۔

آیرج، انسان تو انسان، چیونٹی تک کا ستانا نہیں دیکھ سکتا اور بھائیوں سے کہتا ہے کہ وہ بھی جان رکھتی ہیں! انسانیت (ہومینیٹی) کی ایسی تعلیم اتنی صاف اور کہاں ملے گی؟ ایسی نصیحت بھی کارگر نہ ہو تو پھر فضیحت جائز! خون کا بدلہ خون ہے۔ ایرج مارا جاتا اور ایرانیوں پر تورانیوں کا خون حلال ہو جاتا ہے۔

فردوسی ایسی تمہید اور اتنی بڑی نصیحت کے بعد اس ہولناک جنگ کی ابتدا کرتا ہے جو ایرانیوں اور تورانیوں میں صدہا سال جاری رہی۔ سلم اور تور بعد کو آیرج کے نواسے (مینوچہر[1]) اور باپ (فریدوں) پر چڑھائی کرتے ہیں اسلیئے کہ بادشاہ نے اپنے شہید بیٹے کی اس اولاد کو اپنا جانشین بنا دیا ہے۔

---

[1] مینوچہر حد کا خوبصورت تھا اسلیئے اسکا یہ نام پڑا۔ مینو بمعنے بہشت، اور چہر، چہرا، صورت۔

منو چہر جنگ کے لئے نکلا۔ نریمان و سام (رستم کے دادا و پردادا) اس کے ساتھ ہیں۔ سلم اور تور مارے گئے۔ لڑائی فتح ہوئی۔ لیکن دلوں کا بغض سر نہ ہو سکا۔ تورانی نسل میں اُودھر افراسیاب پیدا ہوا اور ادھر ایرانی گھر کا محافظ رستم میدان میں آگیا۔ اور یہ خاندانی جنگ اُسوقت تک قائم رہی جب تک افراسیاب زندہ اور رستم مرد میدان رہا۔

تورانی ہمیشہ ابتدا کرتے۔ جنگ چھیڑتے اور رستم اپنے ملک و قوم کی حفاظت (دفاع) کرتا۔ اسلئے ایرانیوں کا یہ فعل جائز تھا۔ ان جنگوں کی تاریخ، اُن کا سبب اور پھر اُن کے نتیجے بیان کر کے فردوسی نے دُنیا کو وہ سبق دیا ہے۔ جس کی نظیر اُس سے قبل نہیں مل سکتی۔ اسی سبق اور اسی کے بیان پر اس کے کارنامہ کی بنیاد ہے۔ ایک معلّم، خونخوار انسان کو ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است کہ جاں دارد جان شیریں خوش است

سے زیادہ کیا سبق پڑھا سکتا اور اُس کی حیوانیت کو اور کس طرح دُور کر سکتا ہے؟!۔

فردوسی کے بعد۔ یہ نامۂ عجم، ہر دَور میں جام جم بنا رہا ؎

بدین نامہ از چند بشتافتی   کنوں ہر چہ جستی ہمہ یافتی

(شاہنامہ) ضرورت اور مشکل کے وقت یہ کھلتا اور کھولنے والوں کے حوصلہ وظرف کے مطابق اس میں سے بہت کچھ ملتا رہا ہے۔ اس میخانۂ طوس سے بادۂ شیراز ہی نہیں، خم خیام بھی سیراب ہوا ہے۔ اس ایک شمع سے سَو شمعیں جلیں اور اس ایک کتاب سے ہزار کتابیں بنیں!

ابن سینا[1]، حکیم ہیں اور ہمارے بقراط اور فردوسی کے کچھ ہی بعد کے۔ وہ بھی دُنیا کی شفا کے لئے اپنے حیّ ابن یقظان کی داستان چھیڑتے ہیں۔ ایک تو فردوسی کو سلام کر کے آگے بڑھتے ہیں اور شاہنامہ کے زال کو یاد دلاتے ہیں۔ تم بھی یاد کرو۔

"سام کے گھر زال پیدا ہوا تو وہ حد کا گورا، اور سر سے پیر تک سفید تھا۔ اُس کے روئیں اور بال تک رُوپہلی تھے اور چاندی کی طرح چمکیلے۔ اس لئے اس کا نام زال (یعنی پیر، بڈھا) رکھا گیا۔ بیٹے کو دیکھ کر، باپ (سام) ڈرا اور اُسے جنّاتی (یعنی غیر معمولی)

---

[1] حکیم بو علی سینا۔ ۴۲۸ھ مطابق ۱۰۳۷ء۔

لڑکا سمجھ کر کوہ آلبرز پر پھینک آیا کہ وہاں جانوروں کا شکار ہو جائے۔ پہاڑ پر ایک سیمرغ (سی مرغ اور چینی کہاوت کا ایک درویش[1]) تھا۔ اس نے اس بچہ کو اُٹھا لیا اور پالنے لگا۔ وہاں زال، اُس سیمرغ کی ریاضت اور نیچر، کی سی دایہ کی شفقت سے پل کر بڑا ہوا۔ اور یہاں سام مدتوں اپنے اُس بچے کو بھولا رہا۔ مگر آخر بشارت ہوئی۔ کہ۔

پسر گو، بتزدیک تو بود خوار مراد ہست، پروردہ کردگار

سُن۔ کز و مہرباں تر بد و دایہ نیست

ترا خود بہ مہر اندر دل پایہ نیست

سام اس غیبی آواز سے چونکتا، دوڑتا، آلبرز پر چڑھتا زال و سیمرغ سے ملتا اور بچے کو گھر لے آتا ہے۔ سیمرغ، زال کو رو کر رخصت کرتا اور کہتا ہے کہ ترا پرورندہ یکے دایہ ام

ہمت دایہ، ہم نیک سرمایہ ام

---

[1] سی مرغ کی اصلیت اس بیان کے دوسرے حصّہ میں پڑھنا۔

یوں تو تجھے قدرت نے پالا، مگر ہم بھی تیری دائی رہے ہیں۔ خیر، سدھار، خوش رہ، یہ پَر[1] لے، مصیبت میں کام آئیں گے اور اس سے تیرے خاندان کو پر لگ جائیں گے۔ زال کی پرورش قدرت نے کی تھی اور وہ قوی اور صاف آب و ہوا میں پلا تھا۔ اسکا غیر معمولی انسان اور ایک تنومند پہلوان ہونا لازمی تھا۔ رستم، اسی زال کا فرزند ہے اسلئے توانائی میں اول سے دہ چند ہے۔ سیمرغ کی سی دایہ کے دئے ہوئے پراَ تھموں میں اسکے کام آتے، اور قدرت کے تماشے دکھاتے رہے!"

اُس پُراثر غیبی آواز سے

کزو مہربان تر بدو دایہ نیست ۔۔۔ ترا خود بہ مہر اندرون پایہ نیست

یعنی ہم اپنی مخلوق کی خود حفاظت و پرورش کرتے اور جس کا کوئی سہارا نہ ہو اسکے ہم سہارا ہیں، کی سی تعلیم سے شیخ الرئیس نے بھی سبق لیا اور، آدم کی کہانی بو علی کی زبانی وجود میں آگئی! یہ ایک فلسفیانہ ناول ہے۔

---

[1] اُس پَر کی حقیقت بھی اس بیان کے دوسرے حصے میں دیکھنا۔

جس کا خلاصہ یوں ہے۔

"ایک عورت کشتی میں کہیں جارہی تھی۔ وہ تباہ ہوئی اور عورت (جو حمل سے تھی) سمندر کی موجوں اور تھپیڑوں سے کسی طرح ایک جزیرے کے کنارے جالگی۔ عورت اُتری، جنگل کی طرف چلی، وہاں رہی، بچہ ہوا۔ اُسکا نام حَی (زندہ) رکھا گیا۔ یہ معصوم چند ہی دنوں کا تھا کہ ماں مر گئی۔ ایک شیرنی کا اُدھر گذر ہوا۔ اُس نے بچے کو اُٹھالیا اور اسے اپنے دودھ سے پال نکالا۔ حَی اب بڑا ہوا، اور اس ماں (شیرنی) کے ساتھ رہنے اور جنگلیوں کی ادائیں سیکھنے لگا۔ مگر چونکہ قدرت نے اُس کی پرورش کی بھی اور سے

گز وہنر باں تر بد و دایہ نیست

غلط نہ تھا۔ اُس (حَی) کے قُوا دوسرے بنے اور نیچر کی مدد سے حَی کی عقل و ہوش، جانور تو جانور، معمولی انسان سے بھی تیز تر ہوئے۔ بغیر تعلیم (کتابی)، وہ حکیم بنا۔

اب شیرنی بھی مر گئی۔ یہ پہلی موت تھی جو حَی کے ہوش میں واقع

ہوئی۔ وہ حیران تھا کہ یہ کیا سانحہ گذرا۔ بار بار شیرنی کو دیکھتا،
اُسے جھنجھوڑتا اور چاہتا ہے کہ وہ بولے۔ مگر کامیابی نہ ہُوئی۔ آخر
اس کی لاش چیری کہ دیکھیں اس میں وہ کیا چیز تھی جسکے نہ رہنے
سے شیرنی کی یہ حالت ہو گئی؟ پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مُردہ کی
اور زیادہ تشریح کی۔ اب وہ جسم کی ترتیب و نظام سے آشنا
ہُوا۔ غور کرنے لگا کہ ایسی عمدہ صنعت کا کاریگر کون ہے؟ اس
فکر سے وہ بڑے بڑے رازوں کو سمجھا اور آخر اُس ہستی تک دماغ
دَوڑا جو کُل صنعتوں کی اصل صانع ہے۔ حَیّ اس طرح رفتہ رفتہ
محض اپنے زورِ دماغ اور غور و فکر سے اپنے زمانہ کا ایک جَیّد
حکیم و فلسفی بن گیا۔ اور جب وہ اُس جزیرے سے آبادی میں
لایا گیا اور آدمیوں سے ملا تو اپنی جنس کو دیکھکر بیحد خوش ہُوا،
اُس جگہ کے لوگوں کو اُس نے تعلیم دی اور اُنھیں خدا پرست بنا دیا۔"

شیخ کے اس قصّہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان، ظاہری تعلیم کے بغیر بھی قدرت
کی مدد سے عالِم بن سکتا ہے۔

ابنِ سینا حکیم ہے اسلیئے وہ اپنے اُس حَیّ کو حکیم بناتا ہے اور فردوسی،

شاعر ہے اور جنگوں کے لئے اُسے پہلوان تیار کرنا ہے۔ اسلئے وہ زاؔل کی پرورش کا حال بیان کرکے۔ قدرت کے کرشمے دکھاتا اور اُسے (زاؔل) ایک زبردست پہلوان بنا کر دُنیا کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ہے۔ شاہنامہ شیخ کی پیدائش یعنی ۹۸۰ء[1] تک تصنیف ہو کر ملک میں عام ہو چکا اور نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا اور خوارزمیوں، (جہاں شیخ کی نشو و نما ہوئی) تک پہونچ چکا تھا۔ اسلئے ابن سینا کی نظر سے اُس کا نہ گذرنا خلاف عقل ہے۔ پھر یہ تصنیف (شاہنامہ) علاوہ اَور وجہوں کے، سلطان محمود کی سردمہری کے باعث، اس وقت حد کی شہرت پا چکی اور دیلمیوں کے علاوہ قابوسیوں اور خصوصاً، علاءالدولہ کے دربار میں بھی ایک پایہ رکھتی تھی۔ شیخ کی عمر کا اخیر حصّہ اس علاءالدولہ کی سرکار میں گذرا (چہار مقالہ)

اس لحاظ سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ بُو علی نے بھی اپنے زمانے کی اُس بہترین تصنیف (شاہنامہ) کو ضرور پڑھا اور اس کے زاؔل کے قصّے سے

---

[1] شیخ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۰۳۷ء میں مرا۔

شیخ نے متاثر ہو کر حی ابن یقضان[1] کا سا ناول ترتیب دیدیا!

. . . .

. . . .

یہ تو ہمارے ان ایشیائی باکمالوں کا احوال ہے جنھوں نے شاہنامہ سے یوں سبق لیا۔ اب ذرا آگے بڑھو اور فرنگستان کی سیر کرو۔ مگر پہلے اتنا سُن لو کہ ہمارا شاہنامہ کہتا ہے۔ کہ

شاہِ کاؤس کا فرزند سیاوش، کیانی گھر کا چشم و چراغ تھا۔ رستم نے اس شہزادہ کی (اپنے مُلک زابلستان میں) پرورش کی۔ وہ جوان اور سپہ گری میں طاق ہوا تو رستم اُسے بادشاہ پاس پہنچا آیا۔ یہ حد کا خوش رو تھا۔ اُس کی سوتیلی ماں سودابہ اُس پر عاشق ہوئی۔ ڈورے ڈالے مگر وہ نہ پھنسا۔ سودابہ نے (زلیخا کی طرح) مکر کیا اور کاؤس سے اُلٹی شکایت کی۔ آزمائش ہوئی۔ وہ مرد تھا

---

[1] اس دلچسپ قصّے (جو عربی میں ہے) کا ترجمہ یورپ کی اکثر زبانوں میں ہوگیا ہے۔ عرصہ ہُوا میں نے اسے اُردو کر دینا چاہا تھا۔ مگر دیکھا کہ مُلک کسی ایسے علمی و فلسفی قصّے کا ابھی شائق نہیں ہوا ہے۔ اسکے ترجمہ کو فضول سمجھا!

اور راست باز۔ امتحان[1] میں پورا اُترا۔ اُس وقت سے بادشاہ اُس پر آور مہربان ہوگیا۔

اِسی زمانے میں تورانی پھر، ایرانیوں پر چڑھے۔ کاؤس نے شہزادہ سیاوُش کو اس جنگ کے لیئے روانہ کیا۔ رُستم ساتھ ہُوا۔ اُدھر افراسیاب (تُورانی) ڈرا کہ رستم کا سامنا ہے۔ جنگ سے صُلح بہتر۔ پیغام بھیجے۔ سیاوُش نے تاوان جنگ مانگا۔ افراسیاب نے اسے منظور کر لیا اور عہد نامہ ہوگیا۔

شاہ کاؤس کو یہ صُلح پسند نہ آئی۔ برہم ہوا۔ اور سیاوُش کو پھر جنگ کے لیئے فرمان بھیجا۔ مگر شہزادے نے اپنے عہد کی شکست کو خلاف دیانت سمجھا۔ باپ (کاؤس) کا حکم بجا نہ لایا۔ اور افراسیاب کے پاس چلا گیا۔ وہاں اُس کی بڑی آؤ بھگت ہُوئی۔ افراسیاب نے اپنی ایک بیٹی فرنگیش نامی بھی اُس سے بیاہ دی اور اطراف چین کا ایک صُوبہ اُسکے علاقہ کر کے وہاں اُسے بھیجدیا۔

---

[1] سیاوُش کے امتحان وغیرہ کا حال اس بیان کے دوسرے حصّے میں پڑھنا وہاں زیادہ مزا آئے گا۔

سیاوش نے اُس جگہ کو ایرانی مذاق کے موافق درست و آراستہ کیا۔ اور شان و شوکت سے رہنے لگا۔ افراسیاب کو اس کی خبر لگی تو ڈرا کہ شہزادہ زور آور ہو کر کہیں اس کا مقابلہ نہ کرے، سیاوش کو بہانے سے اپنے پاس بلایا۔ مگر وہ نہ گیا۔ شاہ توران (افراسیاب) اب لشکر لے کر نکلا اور شہزادے پر چڑھا۔ سیاوش لڑائی پر آمادہ نہ تھا۔ گرفتار ہوا۔ افراسیاب پاس لایا گیا وزیروں اور داناؤں کی سفارشوں اور سمجھانے پر بھی افراسیاب نے نہ مانا اور سیاوش کو بے گناہ قتل کر ڈالا[1]

فرنگیش (افراسیاب کی بیٹی) حمل سے تھی۔ بادشاہ نے چاہا کہ وہ بھی ماردی جائے۔ کہ کیانی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر وہاں پیران ویسا نام ایک فرزانہ تھا۔ بادشاہ اس کا لحاظ کرتا تھا۔ اس نے افراسیاب کو اس قتل سے منع کیا۔ فرنگیش آخر اُسی کے سپرد ہوئی اور حکم ہوا کہ جو بچہ پیدا ہو اُسکی خبر کی جائے۔

---

[1] ایران اپنے سیاوش کو اسکے کیرکٹر کی وجہ سے کبھی نہ بھولا۔ سال میں دس دن اُسکی یاد، منانے کیلئے خاص ہوتے۔ بڑا میلہ لگتا اور جشن ہوتا۔ تیسری چوتھی صدی ہجری تک ایرانیوں میں یہ تقریب قائم رہی

فرنگیس کے لڑکا ہُوا تو بادشاہ سے عرض کی گئی۔ فرمان ہوا کہ وہ مار ڈالا جائے۔ مگر اُسی پیرآن ویسا نے اُسے ایک جگہ پوشیدہ کردیا۔ اس شہزادہ کا نام خسرو رکھا گیا۔ وہ جب بڑا ہُوا، تو اتفاقاً افراسیاب کو اُس کے زندہ رہنے کا حال معلوم ہُوا پیران ویسا سے پوچھا۔ اُس نے عرض کی کہ۔ ہاں وہ زندہ ہے مگر دیوانہ۔ ایسا بچہ سلطنت کے لئے خطرا نہیں ہوسکتا۔ حکم ہُوا کہ۔ وہ لایا جائے۔ اور دیکھا جائے! اب پیران ویسا سخت گھبرایا۔ مگر شہزادے کو سمجھا دیا کہ۔ یہ افراسیاب (تیرا نانا) تیرے باپ کا قاتل ہے اور تیرا بھی دشمن۔ اب اُس کا سامنا ہے۔ حاضر ہونا تو پاگل بنے رہنا اور بادشاہ کے سوالوں کا یوں جواب دینا کہ تو بے عقل سمجھا جائے ورنہ قتل ہوگا۔ خسرو سمجھ گیا۔ حاضر دربار ہُوا تو افراسیاب کے سوالوں کے جواب میں ؎

جو دن کی بھی پوچھی، کہی رات کی

مگر ایسے لفظوں میں کہ اُن سے بادشاہ کا ظلم بھی کھُلتا رہے۔

خسرو حاضر ہُوا۔ افراسیاب ؎

بدو گفت کائے نورسیدہ شباں

زمانہ کی بھی تجھے کچھ خبر ہے۔ جانوروں کو بھی کبھی دیکھا ہے اور اُنھیں سمجھا کیا؟

شہزادے نے جواب دیا کہ۔ جو بے ہتھیار ہو وہ خونخواروں کا کیا شکار کرے۔

افراسیاب ہنسا۔ پھر پوچھا۔ کہ۔ تو ایران کو جانتا اور وہاں کے یلوں سے لڑ سکتا ہے؟

عرض کی کہ۔ یہاں کے جانور منڈلاتے، اُڑتے اور سر پر بیٹھنا چاہتے ہیں وہ ایک دن اس سر سے اُتر کر صدقہ ہو جائیں گے۔

بادشاہ مسکرا دیا۔ سوال کیا۔ کہ تیرا باپ کون ہے اور ایران کیسا ملک ہے؟

جواب دیا۔ کہ۔ شیر، شیر ہی ہے۔ اس کا بیشہ خطرناک ہوتا اور ہر ایک اُس سے تھراتا ہے۔

افراسیاب خوب ہنسا۔ اخیر سوال کیا۔ کہ اچھا زمانے کی نیکی بدی کو بھی سمجھتے ہو؟

خسرو نے قہقہہ لگا کر کہا کہ ہاں خوب۔ معمولی جانور بھی اگر تیز و تند ہو تو شیخی باز شیروں کو نگل جا سکتا ہے۔

بادشاہ اور درباری ہنس پڑے۔ خسرو، واقعی پاگل سمجھا گیا۔ پیران ویسا کی جان میں جان آئی۔

شہزادے کی رہائی ہوئی۔ حکم ہوا کہ اچھا ؎

تو ایں را بہ خوبی بہ مادر سپار

یوں کیانی نسل بچی اور پھر تورانیوں (افراسیابیوں) کی انھیں کے ہاتھوں سے گردن کٹی۔"

انگلستان کا شیکسپیر بھی ڈنمارک کی زمین پر یہی سین کھینچتا ہے۔ ہمارے ہاں خسرو کا باپ سیاوش قتل کیا جاتا ہے اور وہاں ہملٹ کا باپ شاہ ڈنمارک۔ شاہنامہ میں سیاوش کا قاتل اسکا خسر افراسیاب ہے۔ اور شیکسپیر کے یہاں، شاہ ڈنمارک کا قاتل اس کا بھائی ہے۔ فردوسی خسرو کو دیوانہ بناتا اور اس کا معلم پیران ویسا کو بتاتا ہے۔ اور شیکسپیر، ہیملٹ کو ایک بری ارواح (Ghosts) سے تعلیم دلوا کر پاگل بنا دیتا ہے۔ ہمارے یہاں خسرو کا مخاطب اسکا نانا افراسیاب ہے اور تمھارے

یہاں ہملیٹ کا چچا، غاصب شاہ ڈنمارک! خسرو، سوالات کا ذو معنے جواب دیتا ہے۔ اور ہملیٹ بھی اُنھیں دُہری لفظوں سے کام نکالتا اور اپنے ظالم چچا کو پردے پردے میں خوب سناتا ہے۔

دو مختلف ملکوں کے دو مختلف قصّوں کا ایسا تال میل دیدنی اور لائق غور ہے۔ دو زبانوں کے ایسے ملتے جُلتے ہوئے پلوٹ کم نظر آئیں گے۔ اس پر تعجب نہ کرو۔ سُنو۔

شاہنامہ ۱۰۲۵ء (تاریخ وفات فردوسی) تک نشر ہو چکا تھا۔ وہ بعد کو جنگ جُو ترکمانوں (چنگیزی وغیرہ) کے ہاتھ لگا اور ان کی زبان[1] پر تھا۔ جنگ صلیب، اس سے سوا ڈیڑھ سو برس بعد (۱۱۸۷ء) میں ہوئی۔ ہماری طرف ترک (سلطان صلاح الدین) تھے اور اُدھر شاہِ انگلستان، رچرڈ۔ صلح کے بعد، ترکستان و انگلستان میں تعلقات قائم ہو جاتے اور جنس تجارت کی طرح جنس الفاظ و خیالات بھی ایشیا سے یُورپ اور یُورپ سے ایشیا آتی جاتی اور دو ایسی زندہ قوموں کے دماغوں اور دلوں میں بیٹھ

---

[1] شاہنامہ ترکوں میں بھی مقبول رہا۔ ابو سعید چنگیزی تاشقندی نے (۳۶ ۷ ۶= ۶۲۳۱ھ) ترکی میں اس کا ترجمہ کیا۔

جاتی ہیں۔ یہ غیر ممکن نہیں کہ شاہنامہ کی داستانوں کا خلاصہ یا اس کا مواد اِدھر سے اُدھر نہ پہنچا ہو۔ اور پھر بلفاسٹ کے ایملیتھ[۱] کے قصہ فرنچ (۱۵۷۰ء) کی بنیاد نہ بنا اور بعد کو (۱۶۱۰ء) وہ شیکسپیر یا بیکن کی نظر سے نہ گذرا یا اُن کے کانوں میں نہ پڑا ہو۔ اور پھر خسرو کا وہ لاجواب قصہ ہیملٹ کے مشہور و معروف ڈرامہ کا مزید ارپلوٹ نہ بنگیا ہو!

مشرقیوں اور مغربیوں کے اُس اتحاد کے بعد جو جنگ صلیب کے ختم ہونے پر قائم ہوا، سولھویں صدی عیسوی میں خاص طور پر، ایران و فرنگستان کے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں فرانسیسی و پرتگالی، شاہان صفوی کے دربار میں آتے اور کرسی عزت پاتے ہیں۔ گرجستان، ایرانی ہاتھو

---

[۱] ایملیتھ (ہیملٹ) کا قصہ ڈینس (Danes) کی تاریخ سے لیا گیا اور پہلے وہ فرنچ میں (۱۵۱۴ء و ۱۵۷۰ء) میں لکھا گیا۔ اُس وقت شاہنامہ دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ تاشقند کے ابو سعید چنگیزی نے ۷۳۶ھ مطابق ۱۳۲۶ء میں بزبانِ ترکی اُس کا ترجمہ کیا۔ روس میں بھی شاہنامہ کا اثر تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ نوروے، سویڈن اور ڈنمارک بھی اسی کے قصوں سے متاثر رہے ہوں۔

سے، اسی عہد میں فتح ہوتا اور یورپ کا رستہ کھل جاتا ہے۔ شہزادی مریتھا (مشہور ڈسپنا کی بیٹی) اسی دور میں، ایران کی بہو بنتی اور آرمنی و فارسی اتحاد کا بیج پڑ جاتا ہے۔ انگلستان سے بھی سفیر آتے اور رابرٹ شرلی کا اصفہان میں خیر مقدم ہوتا ہے۔ ان شرلی برادران کو ہر تاریخ داں جانتا اور ڈومورکوٹن کو بھی ہر صاحب نظر پہچانتا اور سفر نامۂ پرچیز (Purchan travel) کو، کون سا طالب العلم بھول سکتا ہے۔ ان تعلقات نے ایران و انگلستان کو ایک کیا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور تحفوں کی طرح، خیالات وادبیات کے تحفے بھی تقسیم ہوتے رہے۔ وہی زمانہ (۱۶۰۰ء) شیکسپیر کی تصنیف کا ہے۔ اسلئے اگر ہیملیٹ کے پردے میں خسرو کی تصویر بھی نظر آجائے تو تعجب کی کیا بات ہے!۔

تازی[1] و فارسی

تاریخ دان جانتے ہیں کہ جمشید کو ہلاک کرنے کے بعد ڈہاک (معرّب ضحاک)

---

[1] تاختن دوڑنا۔ اسی سے تازی نکلا، یعنی دوڑنے والے۔ وحشی عرب، ایران کی سرحد کے پار آتے۔ لوٹتے، مارتے اور بھاگ جاتے۔ اسلئے وہ تازی کہلائے۔

عرصہ تک آیران کا مالک رہا۔ یہ غیر ملکی اور عرب تھا۔ عجم ہمیشہ اس کے مخالف اور رعایا پر اس کے ظلم وستم سے نالاں تھے۔ تہمورس (طہمورث) کی نسل مٹانے کی اس نے اتنی کوشش کی کہ اُس قدیم شاہی خاندان کے شہزادے ملک سے بھاگے اور چھپ گئے۔ مگر اس گھر کا ایک شہزادہ آبتین نام پوشیدہ طور پر وہیں رہا۔ دہاک کو اس کی خبر لگی۔ آبتین پکڑا گیا اور قتل ہوا۔

اس شہزادے کا ایک بہت کم سن بچہ (فریدوں) تھا۔ اُس کی ماں اسے لے کر بھاگی اور جنگل کی طرف چلی۔ وہاں ایک راہب ملا۔ فرزانگ (فریدوں کی ماں) اس کے قدموں پر جھک گئی۔ اپنی مصیبت بیان کی راہب کو رحم آیا۔ اور اُس نے جھوپڑے میں اُسے پناہ دی۔ وہاں پُرمایہ (دودھ والی یعنی بڑی دودھیل) نام ایک گائے تھی۔ فریدوں اُس کے دودھ سے پلنے لگا۔ یہ جب سیانا ہوا تو فرزانگ راز کھل جانے کے ڈر سے اُسے کوہ البرز پر لے گئی اور وہاں رہنے لگی۔

دہاک کے جاسوس بلا کے تھے۔ اُنھوں نے فریدوں کو ڈھونڈ نکالا۔ بادشاہ کو خبر دی۔ حکم ہوا کہ۔ وہ ابھی پکڑ لایا جائے۔ ہرکارے دوڑے۔ جنگل میں

پہونچے۔ مگر وہاں اسوقت نہ فرزانگ تھی اور نہ اس کا بچّہ۔ وہ آلبرز پر تھے
ذہاک نے غصّہ میں اس غریب راہب اور بچاری پُرمایہ کو مار ڈالا۔

ایسے ظلموں سے خلقت اور نالاں تھی۔ مُلک بگڑا اور رعیت باغی
ہوگئی۔ وہاں کاوہ نام ایک آہن گر (لوہار) تھا۔ اُس نے اپنی جماعت
تیار کی۔ علم بغاوت نکالا۔ اُس کا پھرہرا کاوہ کی بھاتی[1] (چمڑے کی) کا
تھا۔ علم کا نکلنا تھا۔ کہ خلقت ٹوٹی اور اس کے ساتھ ہوگئی۔ کوہ آلبرز پر
فریدوں اب جوان تھا۔ اس بغاوت کی خبر کسی طرح اُسے بھی پہنچی اپنے
خاندان کے دشمن، جمشید کے عُدو اور اپنے باپ کے قاتل، غیرملکی ذہاک
سے بدلا لینے نکلا۔ ہتھیار درست کئے۔ ایک گرز بنایا اس پر اپنی پُرمایہ
(جسکے دودھ سے پلا تھا) کے سر کی نقل بناکر بہ طور یادگار رکھی اور چلا۔ یہ
گرزگاؤسر تاریخی بنا۔ وہ نریمان کو عنایت ہوا۔ پھر سام و زال پاس رہا اور اخیر
میں رستم کے ہاتھ میں آکر بڑے بڑے معرکے سر کرتا رہا۔

من و گرز و میدان و افراسیاب ؎

میں اسی گرز کی طرف اشارہ ہے۔

فریدوں کاوا سے ملا۔ عجمی ساتھ ہوئے۔ کاوا اپنا علم لئے شہزادہ کے

---

[1] بھاتی یا بھاتھی۔ وہ چمڑا جس سے لوہار آگ پھونکتے ہیں۔

ہمراہ، ضحاک پر چڑھا۔ وہ بھاگا۔ آخر پکڑا گیا۔ قید ہوا۔ اور فریدوں، شاہِ ایران بنا۔ کاوا کا وہ علم دُرفش کاویانی[1] کے نام سے دُنیا میں بلند نام ہوا۔ یہ دُرفش ایرانیوں کا قومی نشان تھا۔ وہ تورانیوں اور افراسیابوں کے مقابلے میں بھی نکلتا اور اپنا اَوج دکھاتا رہا ہے۔ مینوچہر (فریدوں کا پَروتا) کی فوج میں بھی وہ اڑتا اور آسمان سے باتیں کرتا رہا۔ توران کی لڑائی میں شاہی لشکر کے ساتھ تھا۔ مینوچہر میدان میں پہنچا۔ خیمے گڑے۔ اور ؎

سراپردۂ شاہ بیروں کشید
دُرفش ہمایوں بہ ہاموں رسید

اس شان سے وہ زیرِ آسمان کھڑا رہا ہے! ایرانی اپنے اس نشان کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ کیانیوں سے لیکر ساسانیوں کے وقت تک اسکی حُرمت قائم رہی۔ ہر بادشاہ اپنے اس درفش کے دامن کو زر و جواہر سے بھر اکیا اور اس کی شان دو بالا کرتا رہا ہے۔ یزدگرد کے وقت میں، نئے تازیوں کے مقابلے میں بھی وہ نکالا گیا۔ مگر جنگ قادسیہ

---

[1] کاوا کے نام سے وہ درفش (علم) بلند ہوا۔

میں آخر ٹھنڈا ہوا۔ اور گرسنہ عربوں کے ہاتھ لگ کر پارہ پارہ ہو گیا۔
فریدوں، غیر ملکیوں کو ملک بدر کر کے کچھ ہی دن دم لینے پایا تھا کہ اس کے بیٹوں (سلم، تور[1]، اور ایرج) میں اختلاف شروع ہوا۔
اس کشاکش میں ایرج کام آیا۔ فریدوں نے اپنے اس چھوٹے بیٹے کا بڑا غم کیا۔ بعد کو ایرج کے نواسے مینو چہر کو اس نے پالا، اپنا جانشین بنایا اور سلطنت اُسے دیدی۔ سلم و تور باپ (فریدوں) سے بگڑ کر ایران پر چڑھے۔ ان کے مقابلہ پر مینو چہر نکلا۔ جنگ ہوئی اور سلم و تور، کھیت رہے۔ شاہِ توران مٹے مگر توران نہ مٹا اور ایرانیوں اور تورانیوں کی جنگ سینکڑوں برس جاری رہی۔ انھیں جنگوں نے اُدھر (توران) افراسیاب کو پیدا کر دیا اور اِدھر (ایران) رستم کو۔ شاہنامہ کے اصل دو ہیرو (Hero) ہیں۔ اور اُن کی لڑائیوں کا فسانہ اس کارنامہ کا سرنامہ ہے۔
ایران ہمیشہ سے خدا پرست اور کسی ایک صانع کا ماننے والا تھا۔

---

[1] تور کے نام سے توران اور ایرج (یا ایران) کے نام سے ایران نکلا۔

خالق کے لئے قدیم فارسی کا لفظ خود آ، (جو کثرت استعمال سے) خُدا بنا خود کہتا ہے کہ آیرانی قُل ھُوَاللہُ اَحَد، ہی کے قائل نہیں بلکہ اُس صانع کے (بلا شرکت غیرے) خود بخود موجود ہو جانے کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اسلئے وہ، وجود باری تعالیٰ اور توحید کے مسئلہ میں یہودیوں اور مسلمانوں کے برابر تھے۔ ہاں بآسانی اس کا پتہ نہیں ملتا کہ اُن (ایرانیوں) کی زمین پر کب اور کس کس نبی[۱] کا ظہور ہُوا جس نے ان کو وحدانیت سکھائی اور اُنھیں ایک روشن و مضبوط قانون بھی دیا؟ مگر کیخسرو (تقریباً ۳ ہزار برس قبل مسیح) کے بعد ہی اُن کے یہاں ایک نبی ظاہر ہوا۔

کیخسرو نے سلطنت ترک کر کے اپنے فرزند لہراسپ کو بادشاہ بنا دیا۔ اور خود عبادت الٰہی میں مصروف ہوگیا۔ اس لہراسپ نے بھی آخر دُنیا کو چھوڑا۔ اور اپنے ولیعہد گشتاسپ کو سلطنت دیکر گوشہ نشین ہوگیا۔ اسی گشتاسپ کے مبارک زمانہ میں اُس آریا و آیرانی پیغمبر کا ظہور ہوا جسے (اَشو) زردشت کہتے ہیں۔ اس عجمی نبی نے مذہبی معاملات میں ایران کو

---

[۱] شہزادۂ فرہاد میرزا، اپنے نامۂ خسروان، میں قدیم ایران کے اکثر بادشاہوں کو نبی بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اور مضبوط کردیا۔ اور جب سے وہ زمین، آئین پرست (ایک قانون کے ماتحت) ہوکر آباد و آراستہ ہونے لگی۔ توران (جنگ جوئی کے سوا جس کا کوئی مذہب و مسلک نہ تھا) ایران کے اُس نبی (زردشت) کے خلاف اسلئے کھڑا ہوگیا کہ زردشت نے کشت و خون کو منع کرکے زمینِ خدا کو آباد کرنے اور سنوارنے کا سبق دیا تھا۔ یہ احکام، تُورانیوں کے مسلک کی ضد تھے۔ تورانیوں اور آیرانیوں میں اب مذہبی جنگ چھڑی جو اسفندیار (پسرِ شاہِ گشتاسپ) کے بازوؤں سے سر ہوئی! توران (یا تُرکمان یا مُلکِ ترک) خدا پرست ہُوا ہو یا نہ ہُوا ہو اور اُن کی وحشت دُور ہو کر اُن میں آئین پرستی بھی آگئی ہو یا نہ آگئی ہو، مگر ایران اُسوقت سے کیانیوں کے اخیر بادشاہ دارائے (دوم) کے وقت تک مذہب پرست اور آئین دوست بنا رہا۔

آیرانی (کیانی)، توران سے فارغ ہو لئے تو اپنی زمین کو گلزار بنانے لگے اُن کا دارَاب (اوّل)، وہ شاہ فارس ہے جس نے اپنے مُلک سے قریب کے وحشیوں کو رام اور یاجوج و ماجوج[ل] کے سے خونخواروں کا سدّباب کردیا۔

[ل] ذوالقرنین (دو سینگ والے) یہ لقب اس بادشاہ کا ہے جو حضرت دانیال (باقی برصفحہ)

یہ سدّ، داراَبند کہلاتا اور اب بھی موجود ہے۔ اس طرح اپنے ملک کو جنگلیوں اور بیرونی حملوں سے محفوظ کرکے وہ اور طرف بڑھا۔ مِصر کو اُسی نے زیروزبر کیا۔ یونان کا طبقہ اُسی نے الٹا۔ اور اُس زمین کو بھی اپنے زیرنگیں کرکے، ایراَن کا باج گذار بنا لیا۔ مصر و یونان سے حکمتیں لایا اور ایراَن کو بھی ان نعمتوں سے مالامال کر دیا۔

یوناَنی سلطان فِلپ (جو ایران کا باجگذار تھا) کے بعد اُس کے بیٹے سکندر[1] کا نصیبا چمکا۔ اُسے ایران کی سروری شاق تھی، داراَئے دوم

بقیہ صـ۵ (نبی) کے ایک خواب کے مطابق دو بڑی سلطنتوں کا مالک تھا۔ اس بادشاہ کو سکندر سمجھنا غلط ہے اسکے سفر کا حال اور یونان سے ایران و ہند تک آنے کا رستہ معلوم ہو چکا ہے۔ اُس نقشہ میں کوئی ایسا مقام نظر نہیں آتا جہاں اس نے اُن وحشی قوموں (یاجوج و ماجوج) کا سدباب کیا ہو۔ یہ دارائے اوّل (۵۴۸ - ۵۲۱ قبل مسیح) بادشاہ ایراَن و میدیا دو عظیم سلطنتوں (ذی القرنین) کا مالک تھا۔ جس نے ایران کے ان سرحدی وحشیوں (یاجوج و ماجوج) کا رستہ بند کرکے اپنے ملک کو محفوظ کر لیا (یہودی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ذکر دارا)

[1] یہ بھی مشہور ہے کہ دارائے اوّل، یونان سے فلپ کی بیٹی ناہید کو گھر لے آیا۔ اس سے شادی کی۔ مگر اُس کے دہن سے بو آتی تھی اس لئے اسے رخصت کر دیا۔ وہ حمل سے تھی۔ سکندر اُس سے پیدا ہوا۔ لیکن فلپ نے اسے چھپایا اور سکندر کو اپنا فرزند مشہور کر دیا۔

کو زیر کرنے نکلا۔ دارا، اپنے چاکروں[1] کے ہاتھ سے شہید ہوا اور سکندر بے لڑے فارس کا مالک ہو گیا۔

سکندر کے بعد ایران ابتر تھا۔ قدیم ہندوستان کی طرح وہاں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنتیں اور بگڑتی رہیں۔ آخر ایک ایرانی شہزادہ اَرتک شتر پا پگانو[2] (اردشیر بابکاں یا ساسانی) اپنے ملک کی یہ حالت دیکھکر اٹھا۔ اُس نے اُن ریاستوں کو مٹا کر ایک مضبوط سلطنت قائم کی۔ اور یونانیوں کے ہاتھوں سے جو صنا دید (عجم) برباد ہوئے تھے۔ انھیں بھی ازسرِ نو درست و آباد کرنے لگا۔ اپنے گم شدہ مذہب (زردشتی) کو بھی اُس نے تلاش کیا اور اُس میں تازہ روح پھونکی۔ اِس اقبال مند بادشاہ کے نام سے وہ خاندان روشن ہوا جسے ساسانی کہتے ہیں۔ اور جس کے اقبال

[1] سکندر اور دارا میں ابھی جنگ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دارا اپنے دو ندیموں (ماہیار اور جاں سپار نام) کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔ سکندر نے سُنا تو بیحد غم کیا اور اُن قاتلوں کا سر قلم کر ڈالا۔

[2] یہ لفظ متعدد طرح لکھا اور بولا گیا ہے۔ تورانی و تُرکی میں اُردو شیر (یعنی ایک گروہ یا لشکر کا شیر و سردار) ہے۔ یہی لفظ اُردو یورپ جا کر ہُورد (Hord) بنا۔ اور ہند میں وہ ہماری زبان ہو گیا۔

کی بہار (تین سو برس بعد) قادسیہ کے میدان میں جوشیلے عربوں کے ہاتھوں سے آخر خزان ہو گئی!

اردشیر کے بعد عرصہ تک ایران میں کوئی ملکی و مذہبی انقلاب نہ ہوا، لیکن اُس کی اولاد میں شاہ پور وہ بادشاہ ہے جس کے عہد میں حکیم مانی کے ارژنگ نے مذہبی جنگ چھیڑ کر خدا پرست زردشتیوں کو مورت پرست بنانا چاہا۔ مگر اس شاہ پور کے پوتے بہرام نے اس کا رنگ مٹا کر اپنے مذہب کو رنگینیوں سے بچا لیا۔

یعقوبی، صاحب الفہرست اور بیرونی کے سے مؤرخوں نے اس مشہور مانی کا جو حال لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

وہ سنہ ۲۱۵-۱۶ء میں پیدا ہوا۔ یہ ہمدانی تھا مگر بابل اور عراق میں اس کی عمر گذری۔ وہاں اُس نے ایک نئے مسلک کی بنا ڈالی اُس کا عقیدہ تھا کہ یہ عالم ظلمت و نور سے گھرا ہوا ہے۔ اور اُن دو کے دو علحدہ خالق ہیں۔ اور یہ کہ۔ یہ دُنیا بسنے بسانے کی جگہ نہیں اسے اُجاڑتے اور خود کو فنا کرتے رہو۔

مانی کا یہ مسلک زردشتیوں کی ضد تھا۔ وہ نہ اوّل تو کائنات

کا ایک ہی خالق مانتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آشوزردشت نے
ملک کو آباد کرنے کا حکم دیا اور رہبانیت کو منع کیا تھا۔ اس لئے
وہ مانی کے خلاف ہوئے۔ شاہ پور نے مذہبی مباحثہ کرایا۔ مانی
ہارا، اور آخر ہندوستان، تبت اور چین کی طرف چلا گیا، اور
وہاں اپنا عقیدہ پھیلاتا رہا۔ شاہ پور کے بعد اس کا بیٹا ہرمز،
بادشاہ ہوا، اور پھر بہرام (اوّل) اس نے مانی کو ڈھونڈ نکالا،
بلایا۔ پھر مباحثے کرائے۔ اور کہا کہ اچھا تم دنیا کو ناپاک سمجھتے،
اور اُسے مٹانا چاہتے ہو تو تم کو سب سے پہلے فنا ہونا چاہیئے!
یہ کہکر بہرام نے اُسے قتل کر دیا (۲۷۲ء)

مانی کی طرف اکثر کتابیں بھی منسوب ہیں جو اس نے اپنے عقیدے کے
متعلق لکھیں اور عام کیں۔ اس نے ایک طرح کے نہائت خوبصورت حروف
بھی ایجاد کئے تھے جو تصویروں کی شکل میں (بطور رمز) لکھے جاتے تھے
جس کتاب میں وہ حروف تحریر تھے وہ آرژنگ (یا ارتنگ) کے نام سے
مشہور ہوئی۔ مانی کا دعویٰ تھا کہ وہ الہامی ہے۔ اسلئے اُس کے مُریدوں
نے اُسے کتاب اللہ کہا۔ آرژنگ مانی وہی مشہور مصوّر کتاب ہے جسکا

نام ہمارے ادب کی زبان پر ہے۔ اور اس سے قسم قسم کی تشبیہیں اور استعارے پیدا کر لئے گئے ہیں۔

مانی فنا ہوا مگر نہ اس کا ارژنگ صفحۂ ہستی سے مٹا اور نہ اس کا عقیدہ مردہ ہوا۔ صاحب الفہرست اور بیرونی کہتے ہیں کہ

"اسلام کے ظہور کے بہت بعد یعنی خلیفہ مہدی عباسی (پدر ہارون رشید) کے زمانہ میں بھی عراق میں، مانی پرست عام طور پر دکھائی دیتے تھے۔ بہت سے لوگ ظاہری مسلمان تھے، مگر در پردہ مانی دوست۔ اُن کے مٹانے کی فکریں ہوئیں مگر نہ مٹے۔ اور معز الدولہ (۳۲۶ھ ۹۴۶ء) کے وقت تک انکی اچھی خاصی تعداد تھی"۔

مانی کے عقاید، تبت و چین و ماچین اور فرغانہ ہی کو نہیں بلکہ دمشقیوں اور عراقیوں کو بھی گھیرے رہے۔ مسلمانوں کے اکثر فرقے اس سے متاثر ہوئے۔ اَلدُّنیَا جِیفَةٌ وَّطَالِبُهَا کِلَابٌ (دُنیا ایک مردار ہے، اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں) کے سے فقرے[1] اُن کی زبانوں پر جاری

---

[1] فنا فی اللہ، انا الحق اور اس طرح کے دوسرے خیالات بھی غیر اسلامی اور مدائن و بابل و عراق اور فرغانہ وغیرہ کے تحفے ہیں جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے دلوں میں گھر کرتے اور انھیں حجازی مذہب سے دور کرتی رہیں۔

ہو گئے۔ جن کے یہاں رُہبانیت حرام تھی اور جنھیں دُنیا کو آباد کرنے اور سنوارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مانیوں کے ایسے عقیدے ہمارے ادب کا تکیۂ کلام بنے اور وہ اکثر صوفی ادیبوں کی زبانوں سے نکل کر عام ہوئے اور ہمارے دلوں میں گھر کر گئے۔

اُن ہی ساسانیوں کا وہ مشہور شاہِ نیک دل ہے جس کا اصل نام کسریٰ اور انوشک رُبان (۵۳۱-۵۷۹ء) ہے مگر عام طور پر وہ نوشیرواں کے لقب سے مشہور ہُوا۔ اس کا زمانہ یادگار رہا۔ ہمارے نبی عربی صلعم اسی کے عہد میں پیدا ہوئے اور حضرتؐ نے اس پر فخر فرمایا۔

نوشیروان کا دَور، عدل و انصاف کے علاوہ اور باتوں کے لئے بھی مشہور رہا ہے۔ آردشیر ہی کے وقت میں ایران اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر حاصل کرنے لگا تھا۔ اُس کے بعد ہر بادشاہ نے اُس پر کچھ نہ کچھ اضافہ کیا۔ مگر نوشیرواں کے عہد میں، ساسانی دارائے کیانی کے ہمدوش نظر آنے لگے۔ رُومیوں نے اسی بادشاہ سے شکست کھائی۔ یونانی فلسفہ و علوم اسی کے زمانہ میں ایران میں عام ہوئے۔ قیصر جسٹنین نے مذہبی تعصب سے جن یونانی حکما اور مشہور فلسفیوں کو اپنے ملک سے بدر

کردیا تھا وہ اسی شاہ عادل و نیک دل پاس آکر سرفراز و ممتاز ہوئے۔

مشہور گبن اپنی تاریخ، عروج و زوالِ رُوما (Decline and fall of The Roman Empire) میں کہتے ہیں کہ۔

"نوشیرواں نہ صرف ایک بادشاہ تھا بلکہ اپنے تخت پر بھی وہ افلاطون کا شاگرد رشید نظر آتا اور حکمت و منطق کے زور سے انصاف کرتا تھا،

(جلد، صفحہ ۳۰۷-۲۹۸ سنہ ۱۸۱۳ء)۔"

ہندوستان سے علوم و فنون بھی اُسی کے مبارک عہد میں ایران گئے۔ چترانگ[1] (شطرنج) کا سا علمی و شاہی کھیل نوشیرواں ہی کے زمانے میں ہند سے ایران گیا اور وہاں وہ شاہی بساط پر دوسری چیز ہوگیا۔ پنچ تنترا کی سی حکمت بھری کتاب بھی اسی دور میں ہند سے ایران گئی۔ شاہی حکم سے وہ، سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئی اور بعد کو وہ عربی جامہ پہن کر کلیلہ و دمنہ[2] کے بھیس میں ظاہر ہوئی!۔

---

[1] چترانگ، چتر، چار اور انگ بمعنی اعضا، شطرنج میں اسوقت چار ہی مُہرے ہوتے تھے۔ اسلئے اُسے چترانگ کہا گیا۔ [2] پنج تنترا، سنسکرت سے پہلوی زبان میں بحکم نوشیرواں ترجمہ ہوئی جسے بعد ابن مقفہ زردشتی نے عربی میں ترجمہ کیا پھر وہ نئی فارسی میں انوار سہیلی کے نام سے چلی۔ اور اکبر کے وقت میں بہار دانش بنی۔

کسریٰ (نوشیرواں) نے خجستان کے ایک مشہور مقام گندِ شاہ پور (جُندِ شاہ پور) میں ایک دارالعلوم (یونیورسٹی) بھی قائم کیا۔ وہاں حکمت وفلسفہ و منطق اور ریاضی اور دوسرے فنون کی تعلیم دی جاتی۔ ایرانیوں نے اس درسگاہ سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔ اُن کے دماغ درست و جولان ہوئے۔ اور پھر اُنھوں نے اپنا فلسفہ ایک دوسری بنیاد پر قائم کیا اور وہ خالص ایرانی تحفہ کہا گیا۔

عربوں کے حملۂ ایران کے وقت گو ان عجمیوں کے قوائے ظاہر کمزور نظر آئے مگر اُن کے قوائے باطن اب بھی قوی تھے۔ اور عباسیوں کے عہد میں جبکہ یونان سے عراق میں علوم و فنون آنے لگے۔ تو ایرانیوں نے بھی ان کے ترجمے وغیرہ میں خاصی مدد دی۔ اس لئے کہ وہ ان چیزوں کو بہت قبل حاصل کر چکے اور اس خصوص میں عراقیوں سے افضل تھے پھر جبکہ عباسیوں کا زوال شروع ہوا تو علم و ادب، ایران کی زمین کی طرف اسلئے کھچ آیا کہ وہ اسکے اہل تھے اور مُبصّر با!

ایران کی علمی و ادبی ترقی میں نوشیرواں نے شاہی حصّہ[۱] لیا۔ اور اپنے

---

[۱] شاہی حصّہ۔ انگریزی میں لائنس شیئر (Loyans Share) باقی صفحہ ۶۶ پر

قدیم مذہب (زردشتی) کو بھی تصرفات سے بچائے رکھا۔ لیکن وہ ایک بے تعصب فرماں روا تھا۔ یونانیوں ہی کو نہیں۔ عیسائیوں کو بھی اُس نے اپنے ملک میں پناہ دی۔ اور اس مذہب (عیسائی) کے وہاں (ایران) رواج میں کبھی اُس نے رخنہ نہ ڈالا۔ اسلئے کہ عیسائی، اُسکے ملک میں سر جھکا کر آئے، سر اٹھا کر نہیں۔ وہ (عیسائی) دلوں کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ نہ کہ زمینوں کو۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُس (نوشیرواں) کے بیٹے انو شازادہ نے جبکہ عیسائیت کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا تو بادشاہ نے اُس سے پرخاش نہ کی (بیرونی، دناوری، گبن)

مانی (۲۱۵ء) کے بعد صدیوں تک ایران میں کوئی مذہبی انقلاب نہ ہوا۔ مگر نوشیرواں کے عہد (۵۳۱ء) میں تین سو برس بعد، مزدک نام ایک مرد اٹھا۔ مانی کی طرح وہ بھی تصور میں تصویر یار کھینچنے لگا! یہ دین بھی زردشت کے پیروؤں کے برخلاف اور نوشیرواں کے سے خدا پرستوں کی ضد تھا۔ مزدک (۵۳۱ء) نے کہا کہ۔

بقیہ ص ۶۵) یعنی شیرازہ حصہ کہا جاتا ہے۔ میں نے یہاں، شاہی حصہ، کہا۔ یہ نیا لفظ ہمارے تصرفات میں سے ہے۔

دُنیا، مِلکِ خدا ہے۔ آدمی اُس کے فرزند ہیں۔ اسلئے خدا کی مِلکیت میں سب برابر کے شریک۔ یہاں تک کہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیبیاں بھی ایک دوسری کی حصہ ہو سکتی اور تصرف میں آسکتی ہیں! یہ عقیدہ ایک قسم کا کمیونزم تھا۔ اس مسلک نے نہ صرف نوشیروانی عہد میں سر اٹھایا اور مُلک میں رخنہ ڈالا۔ بلکہ وہ (عقیدہ) عربوں اور خصوصًا عراقیوں کے دلوں میں بھی راسخ ہوتا رہا۔ خارجیوں اور نہروانیوں نے، جنگ صفین میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے۔ اور الملکُ للہ اور الحکم للہ کا نعرہ مار کر مسلم فوج سے خارج ہو گئے۔

مزدک کی تعلیم، ملک کو برباد کرنے والی اور ایک فتنہ تھی۔ اس لئے نوشیروانی عدل نے آخر اس کا خاتمہ کر دیا!

نوشیرواں نے ایک مضبوط و منضبط حکومت چھوڑی۔ مگر اس کے خلف، رشید نہ تھے۔ سلطنت کی بساط، اس کے بعد، بہت جلد بکھری۔ ایران غفلتوں کا شکار ہو کر پراگندہ ہو گیا۔ عام طور پر اگر نہیں تو شاہی خاندان میں تو مذہب سے بھی لاپروائی شروع ہو گئی۔ ہرمز (سوم) اور بہرام

(ششم) اخیر خلفائے عباسی اور اخیر مغلی دور (ہندوستان) کے شاہوں کے نمونہ اور اپنے وزیروں کی کٹھ پتلی تھے۔ اُمرا، جسے چاہتے، تخت جمشید پر اُسے بٹھاتے اٹھاتے تھے۔ خسرو پرویز بھی اسی طرح تخت نشین ہُوا۔ سلطنت کمزور، رعایا منتشر اور فوج ابتر تھی۔ ظاہری ٹھاٹھ اور بیجا غرور کے سوا حکومت میں کچھ باقی نہ تھا۔ شیریں، اسی خسرو کی وہ محبوبِ نمکین ہے جو فرہاد سے منسوب ہوکر مشہور ہوئی اور ہمارے ادب کی زبان پر چڑھی ہُوئی اب بھی مزا دے رہی ہے! اسی عاشق مزاج و آزاد بادشاہ کے زمانے میں، ہمارے۔ نبیؐ عربی کا ظہور ہوا۔ آنحضرتؐ نے اپنے تشریف لانے کی خبر اور حکمِ خدا کو ماننے کی دعوت، جہاں اور حکمرانوں کو بھیجی، وہاں خسرو کے نام بھی وثیقہ گیا۔ مست و الست پرویز اسے خاطر میں نہ لایا۔ اور آخر اس کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہوگیا۔ پوران دخت، شنین دِہ اور آرزم دخت بھی ملکہ و شاہ شطرنج تھے وہ زچ ہوئے تو ایرانی بساط پر تازی گھوڑے اور پیادے دوڑنے لگے!!

عرب و عجم

زپورِ شنن دہ بہ گویم دگر　　　ازاں شاہ آزاد جویم خبر

اب یزدگرد، محل سے نکل کر تخت کیان پر بیٹھا۔ یہ نام کا گرد تھا کیا بُرد مارتا۔ عرب اسی کے زمانہ میں اُٹھے۔ عجم اُن کا پائین باغ تھا۔ اُدھر آئے۔ اور اُس گلشن سے لالہ و نسترن توڑنے چلے ؎

چمن کی سیر پر ہوتا ہے جھگڑا   کمر میری ہے دست باغباں ہے

رو کے گئے۔ اس کشاکش میں ؎

بدیں گونہ تا ماہ بگذشت سی[۳]   ہمی رزم جُستند تا قادسی

صُلح نہ ہو سکی اور فارسی و تازی کھڑے ہو گئے۔

فوجیں نکلیں۔ دف بجانے اور نائے[۱] کرنانے لگے۔ لڑائی چھڑی۔ اور

؎ بر آمد یکے گرد و پُر شد خروش
ہمہ کر شدے مردم تیز گوش

بڑی خون ریزی ہوئی۔ فارسیوں اور تازیوں کا پُرانا عناد رنگ لایا۔ اور

؎ سہ[۳] روز اندر آنجا یکہ بُود جنگ
بر ایرانیاں بر بُود آب جنگ

وہ بلبلا اُٹھے۔ بے زبانوں نے بھی زبانیں نکال دیں۔ ؎

چناں تنگ شد روز گار نبرد   گِل تر بخور دن گرفت اسپ و مرد

---

[۱] حاشیہ صفحہ ۷۰ پر ملاحظہ ہو۔

اس پر بھی وہ لڑتے ہی رہے۔ اب ہماری طرف سعد (ابن وقاص)
نکلے اور اُدھر سے رستم (دوم) کہ سردار سر دیں اور اس جنگ کو ابھی
سر کریں ؎ لبِ رُستم از تشنگی شد چو خاک
زباں گشت اندر دہاں چاک چاک
مگر اب بھی اُس نے رستمی دکھائی اور ایک جوشیلی قوم کے سپاہی کے
سامنے کود پڑا۔ ؎
کڑکا کے اپنے گھوڑوں کو گرد آگئے سوار
اور اُن مردوں کی نبردوں کا تماشہ دیکھنے لگے۔ یہ دو پلوں کی نہیں
دو قوموں کی ٹکریں[1] تھیں۔ بڑی گاؤزوریاں ہوئیں۔ مگر تلوار نے فیصلہ کر دیا۔
سعد کا ہاتھ اٹھا اور رستم کا ؎
سر دھڑ سے گرا فرق پہ چالیس قدم کے
فیصلہ ہو گیا۔ قدسیہ کی وہ مشہور جنگ یوں ختم ہوئی۔ ؎
چو دست عرب بر عجم چیرہ شد ہمی بخت ساسانیاں تیرہ شد

حاشیہ صفحہ ۶۹ ؎ دف اور نائے باجے ہیں۔ لڑائیوں میں وہ بجائے جاتے۔ اور
اُن سے سپاہیوں کے دل بڑھائے جاتے تھے۔
حاشیہ صفحہ ھذا۔ [1] ٹکر۔ تانیث بھی ہے۔

عجم

زمینوں اور ملکوں کی طرح، مُلکِ دل بآسانی سر نہیں ہوتے۔ یہی حال عَرَب و اِیران اور عَربوں اور ایرانیوں کا رہا۔ زمین ایران، عَرب کا ایک حصہ بنی۔ مگر ایرانی عَربوں کا حصہ نہ بنے۔ دہاک (ضحاک) تازی کے وقت سے عَرب و عَجم کا افتراق چلا آتا اور ایک دوسرے کو نفرت سے دیکھتا تھا مسلمانوں نے فتح ایران کے بعد، عجمیوں کیساتھ جیسا برادرانہ سلوک کیا۔ اگر وہ جاری رہتا تو نہ تازی باقی رہتے نہ فارسی۔ قومی اختلاف دُور ہوتا اور یہ دونوں قومیں ایک ہوکر اور صرف مسلمان بن کر اپنا کام کرتیں۔ مگر جیسا کہ قبل بیان ہو چکا وہ شریفانہ برتاؤ قائم نہ رہ سکا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ڈیڑھ سو برس کے اندر، ایران، عَربی حکومت سے آزاد ہوکر، خود مختار ہوگیا۔ ہمارا آئندہ بیان، عَرب و عَجم کے اس حصّہ تاریخ کا ایک خلاصہ اور پھر ایرانیوں کے دست پاچہ ہو جانے کا ایک مختصر خاکہ ہے۔

نوشیرواں کے بعد، ایرانی حکومت حقیقتاً ایک بھُس بھرا دُنبہ تھی۔ ہر چُھری اس پر چل سکتی تھی۔ مگر عَربوں کو اُس کے دبانے میں ہزار دشواریاں ہوئیں

کیوں؟ عہد قدیم سے یہ دونوں (فارسی و تازی) قومیں ایک دوسرے کو حقارت سے دیکھتیں اور آپس میں لڑتی چلی آتی تھیں۔ فارسی، ان تازیوں کا اپنے ملک پر قبضہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جان توڑ کر لڑے۔ اسلئے جنگ قادسیہ (سنہ ۱۴ھ) سے جنگ نہاوند (سنہ ۲۱ھ) تک چار سال کی لگاتار کوشش اور سخت خون ریزیوں کے بعد مدائن (جو عراق سے ملا ہوا تھا) پر قبضہ ہو سکا۔ یہ جنگ بھی فیصلہ کن نہ تھی۔ فارس اور دوسرے صوبوں کے تصرف میں بہت دن لگے۔ پھر فارسیوں کی جا بجا ریاستیں بدستور قائم رہیں اور وہ عباسیوں ہی کے وقت تک نہیں بلکہ بہت بعد تک باقی تھیں۔ اور انھیں ریاستوں سے آخر وہاں ایک مضبوط و آزاد سلطنت بن گئی اور وہ آج تک قائم ہے۔

اُمویوں نے اَلفَ شہر، ہزار مہینوں یعنی کم و بیش نوّے برس حکومت کی۔ اُن کا عبد الملک (بن مروان) اور حجاج تک ایرانیوں کو سیدھا نہ کر سکا۔ بلکہ اُلٹا ہوا۔ انھیں ایرانیوں کے زور شور سے ان (اُمویوں) کا نشان گرا۔ اور عباسیوں کا علم کھڑا ہو گیا۔ ابو مسلم[1] خراسانی نے دمشق کا طبقہ الٹا۔ اور

[1] ابو مسلم کا لقب۔ امین آل محمدؐ تھا۔ یہ بنی اُمیہ کو تاراج کر کے بنی فاطمہ میں سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک غلطی سے ایسی خلافت کا سہرا، بنی عباس کے سر چڑھ گیا۔

سفاح (عباسی) کا رائت عراق پر لہرانے لگا۔ منصور و مہدی (عباسی) کی خلافت، اصل برمکیوں (ایرانی) کی حکومت تھی۔ وہ سلطنت پر قابض اور اُن خلفاء کو اپنے پنجے میں لئے ہوئے تھے۔

ہارون (رشید) ایرانیوں کے تیور پہچانتا تھا۔ برمکیوں کو زیر کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نہ نکلا۔ کسی ایک خاندان کے مٹا دینے سے کوئی قوم نہیں مٹتی۔ اور اُس کے خیالات و حسیات بہ آسانی محو نہیں ہو سکتے۔ اسلئے اُس (ہارون) نے ایران میں ایک شادی کی کہ اُس بانو سے جو شہزادہ ہو وہ خسرو عجم سمجھا جا سکے اور ایرانیوں کا عربوں سے قدیم قومی تنفر کم ہو کر اُسے (شہزادہ) آئندہ بے زحمت، حکومت مل سکے۔

ہارون نے اس معاملہ میں بھی حد کی کوشش کی کہ اُس کے بعد اُس کے بیٹوں میں صلح رہے۔ اُس نے اپنا وصیت نامہ (کہ اُس کے بعد، پہلے اُسکا بڑا بیٹا امین خلیفہ ہو، پھر مامون) خانہ کعبہ میں لٹکا دیا کہ اس پر عمل کیا جائے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ملکہ زبیدہ (عربن) امین کی۔ اور ایرانی بانو، مامون کی مائیں تھیں۔ ہارون کے مرتے ہی، بھائیوں میں اختلاف شروع ہوا۔ عراقیوں نے امین کا ساتھ دیا۔ اور ایرانیوں نے مامون کا۔ جنگ چھڑی۔ امین نے شکست

کھائی۔ مارا گیا۔ اور مامون تخت خلافت پر بیٹھا۔

طاہرِ ایرانی کی مدد سے مامون خلیفہ ہوا تھا۔ اُسے خراسان کی حکومت ملی۔ مگر وہاں بہت جلد، اس کی اولاد اتنی زوردار و خود مختار ہو گئی کہ خلیفہ وقت کو اُن کے توڑنے میں بڑی زحمتیں ہوئیں۔ آل طاہر کا خاتمہ ایک سیستانی اور خالص ایرانی، یعقوب (لیث) کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور یہ وہی یعقوب ہے۔ جس کی قومی حرارت اور وطنی محبت نے، نوشیرواں کی جمع کردہ تاریخ عجم کو پہلوی سے، اُس وقت کی فارسی میں ترجمہ اور یزدگرد کے حالات اور فارسیوں پر تازیوں کی چڑھائیوں کی واردات، اضافہ کرا کے محفوظ کر دیا۔ یہ وہی مجموعہ تھا جو آل یعقوب کے زوال پر آل سامان کے ہاتھ لگا اور دقیقی کے سامنے رہا۔ اور پھر فردوسی کے شاہنامہ کی بنیاد بن سکا۔

یعقوبیوں کے بعد سامانیوں اور دیلمیوں میں ایران تقسیم ہو گیا۔ عراقیوں کی خلافت اب برائے نام اور سامانیوں اور دیلمیوں کی چوگان بازیوں کا ایک گیند تھی۔ جو کبھی اُن کے ہاتھ آتی اور کبھی ان کے ہاتھ لگتی۔ ان دونوں میں قومی حرارت اور وطنی محبت موجود تھی۔ وہ عراقیوں کی معمولی سروری کو بھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اور خلافت کو اپنے پنجے میں رکھ کر تازیوں کو

فارسیوں کا دست نگر بنانا اور اُن سے اپنا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ یہ اُنھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بغداد اتنا کمزور ہوگیا کہ محمود (سلطان) نے اُس پر چڑھائی کی دھمکی دیدی۔ جسکا ذکر اُوپر ہو چکا۔

انھیں ساما نیوں نے اپنے ملک و قوم کو بڑھانے اور ایرانیوں کو اُبھارنے کی غرض سے دقیقی کو تاریخ عجم کی نظم کا حکم دیا اور جیسا کہ کہا جا چکا وہ کام ادھورا رہ گیا۔ دیلمیوں نے بھی اس میں زور لگایا اور چاہا کہ یہ بڑی چیز اُن کے خاندان سے منسوب ہو اور دُنیا میں اُن کا نام رہ جائے۔ مگر اس کام کا انجام فردوسی کے لئے مقدّر تھا۔ وہ پُورا ہوا اور اُس کا شاہنامہ آخر سامانیوں اور محمود کے نام سے صفحۂ روزگار پر آگیا!

سُن چکے ہو کہ یہ شاہنامہ، ایران میں نشر ہو کر کس طرح ایک حشر بنگیا۔ فارسیوں کو تازیوں کی زبان سے اتنی غیریت تھی۔ کہ اُنھوں نے خوشدلی سے عربی کو آلۂ کار نہ بنایا۔ عباسیوں کے شروع عہد ہی میں، ایرانی اپنی زبان کو یاد کرنے لگے۔ اور عمید[1] الملوک نے آخر ملکی دفتروں سے عربی کو خارج کرکے

---

[1] خلفائے راشدہ کے زمانہ میں بلکہ اسکے بہت بعد تک اکثر دفتروں اور خصوصًا صیغۂ مال کی زبان فارسی تھی۔ بنی اُمیہ نے دفاتر سے فارسی خارج کی۔ مگر اس عمید الملوک ایرانی نے پھر اپنی زبان دفتروں میں داخل کی۔

پھر فارسی کو داخل کرلیا۔ عربی سے عام طور پر اُس وقت وہ وحشت - اور شاہنامہ سے اتنی محبّت تھی کہ اپنے اس قومی کارنامہ کی نسبت اُنھوں نے جوشوں میں مشہور کردیا کہ وہ عربی[1] سے پاک ہے۔!

اس کتاب عجم کا اصلی مقصد "عجمیوں کے حرکت قلب کو تیز کرنا تھا"۔ وہ مطلب تورانیوں اور ایرانیوں کی جنگوں کے بیان اور رستم کی غیر معمولی شجاعت اور وطن کی محبّت اور اس کے دفاع میں اُس کی طاقت و ہمت کے ذکر خیر سے پورا ہوگیا! کتابیں کسی خاص غرض سے آتی ہیں اور اپنا کام کرجاتی ہیں۔ شاہنامہ کی بھی ایک غرض تھی۔ مردہ دل ایرانی اسے پڑھ پڑھ کر زندہ

---

[1] زندہ زبانوں کی تعریف یہ ہے کہ وہ باہر کی لفظیں لیں اور اپنی لفظیں دوسروں کو دیں۔ جو زبانیں اس صفت سے خالی رہیں وہ مردہ ہوئیں۔ فارسی یعنی پہلوی میں ایک عرصہ سے بابلی، کلدانی، سریانی اور عبرانی الفاظ مخلوط ہو رہے تھے۔ عراق عجم کی زبان پر۔ عراق عرب کا اثر بھی تھا۔ اس لئے فارسی قبل سے عربی الفاظ قبول کررہی تھی۔ عربوں کے فتح ایران کی وجہ سے یہ اختلاط شروع نہیں ہوا۔ رہا شاہنامہ کا عربی سے پاک ہونا۔ یہ سراسر مبالغہ اور ایک جوش کی بات ہے۔ ہاں فردوسی نے ضرورت سے زیادہ عربی الفاظ استعمال نہیں کئے۔ اُس زمانے کے لئے یہ بھی بڑی تعریف کی بات اور فارسی کے تیز ہونے کی دلیل تھی۔

ہوئے اور اُسے حفظ کرکے صدیوں کی غلامی سے آزاد ہونے اور عراقیوں کے پنجۂ ظلم سے نکلنے کی فکر کرنے لگے۔ اور اُس میں کامیاب ہوئے۔

سامانیوں کے بعد سلجوقی اُٹھے اور پھر چنگیزی۔ یہ خاندان گو مختلف اور ایک دوسرے کی ضد تھے۔ مگر عراقی سروری کے مٹانے پر تینوں یکدل تھے۔ شاہنامہ، عجمیوں میں جرأت کی روح پھونک کر آئندہ کے لیے اور سبق بھی اُنھیں پڑھا چکا تھا۔ اِن میں سے تازیوں کی تاخت کا اخیر باب کُھلا ہوا تھا۔ اس کتاب عجم کا مقصد کچھ ہی ہو۔ مگر عربوں کی نسبت (رُستم دوم سپہ سالار کی زبان سے) ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید ست کار
کہ مُلک کیاں را کنند آرزو	تفو باد بر چرخ گرداں تفو

کاسار جز ؎ سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

فارسی اُسے پڑھتے اور جھُومتے اور جوش میں آجاتے۔

ایسے شعروں کا اثر نہ صرف دیلمیوں، سامانیوں اور سلجوقیوں ہی پر پڑا۔

لہ جو ذرا فارسی سے مس رکھتے ہیں۔ اُنھیں یہ اشعار ازبر ہیں۔ ادھر عربوں کا ذکر آیا۔ اور یہ شعر زبان پر جاری ہوگئے۔ کسی کلام کی بزرگی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟!

بلکہ وہ عام ہوا۔ اور کل فارسی داں قوموں کے دلوں میں گھر کر گیا چنگیزی بھی فارسی داں ہی تھے۔ اور مرحوم عربوں کی طرح حد کے جوشیلے۔ اور شعلہ ساں بھڑک جانے والے۔ شاہنامہ کی آگ سے دُور کیونکر رہتے؟ وہ جب زور آور ہوئے تو پاس کی زمینوں پر ہاتھ مار کر عراق کی طرف جھپٹے۔ سامانی محمود نے تو خلیفۂ وقت کو صرف دھمکی دی تھی۔ اور سلجوقی طغرل نے تو القائم (عباسی) کو خالی اپنے پنجۂ وشکنجہ میں رکھا تھا۔ مگر یہ چنگیزی اپنے ترکمانی جاندار وصبا رفتار گھوڑے دوڑاتے بغداد کے سر پر سوار ہو گئے ہلاکو نے بغدادیوں کو ہلاک اور مستعصم اور اس کے تازیوں سے عراق کو ایک مدت کے لئے پاک کر کے قادسیہ کا بدلا لیا اور تخت کیان کے آرزو مندوں سے فارسیوں کا تاج چھین کر اُنھیں ترکوں کا بندہ بنا لیا[1]۔ ؎

چنین ست گیہان ناپائیدار!

بغداد کے سویلیزیشن کی یوں تباہی پر بڑے بڑے مرثیے کہے گئے۔ اور حق کہے گئے۔ مگر قومیں کمریں کسنے اور میدان میں آنے سے زندہ ہوتی ہیں نہ کہ مردہ دلوں کے نالوں سے! خیبر کشا فرماتے ہیں کہ الحیات تحت

---

[1] سنہ ۱۲۵۶ھ۔

السّیف۔ زندگی تلوار کی چھاؤں میں ہے! وہ نوحے کیا کر لیتے۔ اور شاہنامہ کے رجزوں کا کیا مقابلہ کر سکتے؟ ایسے مرثیہ خوانوں نے دلوں کا غبار آنسوؤں سے نکال کر ماتمیوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور اس نامۂ پہلوی کے کڑکوں نے عجمیوں کی رگِ حمیت کو استادہ کر کے اُنھیں جوان مرد بنا دیا۔

اور قوموں کے زورِ زبان نے بھی انقلاب ڈالے ہیں۔ یونانیوں کے بعد فصیح و خطیب عرب نے بھی اپنی قوتِ بیان سے جنگیں اُٹھائیں اور مٹائی ہیں مگر وہ اور وقت تھا۔ عراقیوں نے اپنے ظلم[1] سے حجازیوں تک کو بے زبان کر دیا تھا۔ اب اُن کی تیز زبانیں بھی کٹ چکیں اور اُن کی تلواریں نیاموں میں سر ڈال چکی تھیں۔ اُس "تفو باد" کا کیا جواب دیتے اور اپنی قوم کو کیونکر آزاد بنائے رہتے؟ عرب، اُس وقت تک عجم ہو چکا اور جنھیں اُنھوں نے ہمیشہ "گونگا" کہا اُن کا فرد فرد، اپنے شاہنامہ کے زور سے زبان آور بن چکا

---

[1] حجاز کی عظمت اور خانہ کعبہ کی حرمت صرف بنی اُمیہ یعنی یزید بن معاویہ اور عبدالملک بن مروان اور حجاج (وغیرہ) ہی نے نہیں مٹائی بلکہ بنی عباس کے اخیر خلفا نے بھی اُن مقدس مقامات کی وجاہت کم کرنے میں خفیہ حصہ لیا۔ بغداد کو سروری دی گئی مکہ و مدینہ کا اعزاز جاتا رہا۔ عرب اپنے اصل مرکز کو بھولے۔ اسلئے ایک خود فراموش قوم بنکر دو صدی کے اندر گمنام ہو گئے۔

تھا! یہ عرب اب انھیں کیا منہہ دکھاتے اور کیونکر اُن کا مقابلہ کرتے؟!

فارس پر شاہنامہ کا یہ اثر اُس وقت تک تازہ رہا۔ جبتک اُس کے حکمراں اپنی شخصیت کے غرور میں مست نہ ہوئے اور ملک و قوم کو نہ بھولے۔ مگر تیرہویں چودہویں صدی عیسوی میں وہاں کے ادب میں انقلاب شروع ہوا شعرا جن کا اصل کام انسان کے قوائے عقلی و ذہنی کو قوی کرنے اور اُبھارنے کا ہے وہ پستی کی طرف مائل ہونے اور مرد ایران کو عورتوں کا جامہ پہنانے لگے رستم کا رخش اب میدان میں نہ تھا۔ بلکہ اُس وقت کے شعرا کا گھوڑا گلوں پر یوں نازکی سے چل رہا تھا کہ اُسکی پتیاں میلی نہ ہونے پائیں! ایرانی ہفتخواں کے فتح ہونے کا زمانہ گذر چکا اور ملک و قوم سے کہا جاتا تھا کہ ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام	زیر قدمت ہزار جان ست

جہاں ایسی تعلیم شروع ہو گئی ہو وہاں وہ جد و جہد جس میں دوڑ ایک لازمی چیز ہے کیونکر باقی رہ سکتی اور قوم کس طرح آگے بڑھ سکتی تھی؟ اسکے بعد ہی غزلوں کا طوفان اُٹھا اور اُس کے زور میں قوائے عقلی کا شہباز ہوا ہو گیا۔ ان غزلوں کو اُس تصوف نے بھی مارا۔ جس میں مردانگی کے عوض، نسائیت اور پست ہمتی کا زہر بھرا ہُوا تھا۔ ہندوستان نے بھی اپنے ادب

یں شاہنامہ کی نہیں بلکہ فارس کے اُن خیالات کی تقلید کی جو قوموں
کو گراتا اور زندوں کو مُردا کر دیتا ہے! ہمارے یہاں ایسا ادب، اب
بھی موجود اور ہماری نظم میں وہ خیالات ہنوز باقی ہیں جن سے ہماری
ذہنیت پست ہو رہی اور کھڑے ہونے کے عوض ہم معطل بیٹھے ہوئے ہیں!

آیران پر دوسری بلا اُس یونانی منطق و فلسفہ اور افلاطون و ارسطو
کے اُس نظریہ کی نازل ہوئی جو اٹھتے ہوئے دلوں کو بٹھا چکا، رومنوں
کو کھا چکا اور عربوں کو سُلا چکا تھا۔ فارسی ادب نے بھی، بے سمجھے، اور
آنکھ بند کر کے، اسی شَل کر دینے والے فلسفہ و منطق کا راگ گایا اور غریب
ایران کو مدتوں کے لئے ٹھنڈا کر دیا!

ان بد اعمالیوں کے بعد بھی شاہنامہ، ایران میں اور طرح کچھ دنوں زندہ
رہا۔ وہاں کے اہل حواس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کعبۂ ادب،
کے آگے سر جھکایا۔ سعدی تجربہ کار و خوش گفتار ہیں۔ اپنے خدائے سخن
کو وہ یوں سلام کرتے ہیں ؎

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد
کہ رحمت بر آں تربتِ پاک باد

نظامی، اُس تربت پر یوں پھول چڑھاتے ہیں ؎

سخن گوئے پیشینیہ دانائے طوس

کہ آراست رُوئے سخن چوں عروس

اور انوری اُس کے آگے یوں جھکتے ہیں ؎

آفریں بر روانِ فردوسی — آں ہماں نہاد فرخندہ

اُو نہ اُستاد بُود وما شاگرد — اُو خداوند بود و ما بندہ

مگر ایسے عقیدت کیشوں کے بعد کیا ہوا؟ اُن کے گذر جانے پر فارسی ادب کا جوان پھر اپنی وردی میں نظر نہ آیا۔ صفویوں نے اُس کا لباس اُتارا۔ اور اُن کے شاہ حسین نے تو اُسے ننگا ہی کر دیا۔ اُس وقت کے ادب نے فردوسی کے رستم دستاں کو سیستان ہی میں نہیں اصفہان میں بھی ہمیشہ کے لئے گاڑ دیا۔ آتشکدۂ ایران، افغانیوں کے سے فغانیوں[۱]

---

۱ خیال کیا جاتا ہے کہ افغان، اُن یہودیوں کی اولاد ہیں جو بیت المقدس کی دیوار سے لپٹ کر آہ وفغان کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ملک سے بدر ہو کر اس جگہ بسے جو افغانستان کہلاتی ہے۔ وہ فغانی (رونے والے) مشہور تھے۔ اس لئے وہ جگہ افغانستان کہلائی۔

صفویوں کے بعد ایران پر ان وحشی افغانوں کی تسلیط رہی۔

کے ہاتھوں سے سرد ہو کر ماتمکدہ بنگیا! پھر ترکوں کی لکد کوب سے وہ اور اُجاڑ ہوا۔ اور قاچار نے اُسے لاچار کر دیا۔ صدیوں کے بعد اب ملک، ملکیوں کے ہاتھ آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہلوی، فارسی بنجائیں۔ شاہنامہ کھُلے، رستم نکلے اور عجم تازہ دم ہو جائے!!

شاہنامہ ہند میں

آیرانی و ہندوستانی، آریا پوت ہیں۔ ژند و سنسکرت، ماں جائی بہنیں ہیں۔ پہلوی و بھاشا، ایک ماں کی بیٹیاں، اور فارسی و اُردو، ایک گھر کی نشانیاں ہیں! آیرانیوں اور ہندوستانیوں کی برادری بہت پرانی ہے۔ جمشید فارسی، ضحاک تازی کے ظلم سے اپنے ہندی بھائیوں کے گھر پناہ لیتا ہے۔ رستم، سیستانی ہے۔ اور سیستان، ہندوستان کا ڈانڈا۔ ہمارا شنکر ہندی، پہلوان، تورانیوں کی خوشامد سے رستم کے سامنے کھڑا ہوتا ہے ؎

ہمی گشت پیراں بہ پیشِ سپاہ برآمد برِ شنکرِ کینہ خواہ

رستم ؎ بدو گفت، کائے نامبردار ہند

زشرواں بفرماں ترا تا بہ سند

ٹھاٹھ بدل کر دونوں لیس ہو گئے۔ جنگ تھی ؎

کہ رزمے بود درمیانِ دو کوہ

ٹکرائے۔ مگر برابر کے چھوٹے اور پھر گلے ملے!

دارائے کیانی بھیس بدل کر ہند آتا، سیریں کرتا اور گھر جا کر اپنے ہندی بھائی راجہ سے یہاں کے گوٹے مانگتا ہے۔ یہ طائفہ آیران جاتا اور وہاں لولو آن ہند (لالہ) مشہور ہو جاتا ہے۔ کسریٰ یعنی نوشیرواں نے بھی پرانی دوستیاں نباہیں۔ رائے ہندی نے اسے اپنا ملکی تحفہ، چترانگ (چتر، چار اور انگ، اعضا۔ یعنی چار اعضا والا۔ اس وقت اس کے چار ہی مہرے تھے۔ ایران و عرب پہونچکر اس میں اضافہ ہوا) یعنی شطرنج (عربی) بھیجا۔ بادشاہ کے آگے ؎

نہادند پیشِ تخت شطرنج پیش

نگہ کرد ہر اک زاندازہ بیش

اس کے جواب میں آیرانی تحفے ہند آئے۔ اور پھر یہاں سے وہ

کلید دانش گئی جسکا اصل نام پنچ تنترا ہے۔ اور جو پہلوی میں ترجمہ ہوئی اور بعد کو نئی فارسی میں انوار سہیلی کے نام سے چمکی، اور ہند میں (بہ حکم اکبر) بہار دانش بنی! عربوں نے اس کلید عقل سے اپنا قفل دل کھولا اور اُسے کلیلہ و دمنہ کہہ کر اپنا کرلیا۔

کلیلہ بہ تازی شد از پہلوی[۱]

بدیں ساں کہ اکنوں ہمی بشنوی

فارسی، یہاں کبھی بدیسی نہیں سمجھی گئی۔ فردوسی نے بھی ہند کو غیر نہ جانا۔ ہمارا سندھ اور قنوج اس کا تکیۂ کلام اور تیغ ہندی اور سپر سلہٹی اُسکے نوک زبان ہیں۔ وہ زبان آور ہمارے لفظوں کو یاد کرتا ہے۔ ہاتھی ہندی ہے۔ اُسے وہ ہاتھوں ہاتھ لیتا اور اُس کے تعلق کی چیزوں کو بھی اپنی زبان پر چڑھاتا ہے۔ ہمارے یہاں ہاتھی کو گج، بھی کہتے ہیں۔ اسی سے گج باگ نکلی یعنی وہ آنکس جس سے ہاتھی کو مارتے اور چلاتے ہیں فردوسی، اس گج باگ کو اپنے لہجہ میں یوں یاد کرتا ہے ؎

[۱] ابن مقفعؔ زردشتی نے اسے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ تقریباً ۷۶۰ عیسوی۔

کجک بر سرِ فیل زد شاہِ چین
بہ غُرّید چوں صیحۂ فروردیں[1]

کوٹلا، ہماری گڑھی یا پہاڑی ہے اور اُس کا رکھوال، گڑھ وال یا کوٹ وال۔ فردوسی اس لفظ کو اپنا کر کے کہتا ہے ؎

چو آگاہ شد کوتوال حصار برآویخت با رستم نامدار

شاہنامہ کا اثر دیکھو کہ ہند، اپنی چیز بھولا اور (کوٹ وال کی جگہ) اُس کے کوتوال کو یاد کر کے اسی طرح بولنے لگا!

ترکوں کی صحبت سے مدت بعد بچھڑی بہنیں (سانسکرت کی نام لیوا، بھاشا۔ اور پہلوی کی جانشین، فارسی) ملیں۔ اُن کے وقت میں مرحوم سنسکرت کی زندہ بہن فارسی، یہاں پھر تازی ہُوئی۔ سکندر لودی کے زمانہ میں وہ بڑھی۔ پنڈت ڈونگر مل، اُسی نادر دَور کے یادگار اور فارسی کے اُستاد شمار ہوئے ہیں۔ ہمارے برہمن[2] (پنڈت چندر بھان)

---

[1] فرودین۔ وہ فارسی شمسی مہینہ ہے جس میں ابر اٹھتے اور گرجتے ہیں۔
[2] یہ وہی شاہجہانی مشہور برہمن ہیں جن کے اس لاجواب شعر کی خود بادشاہ نے تعریف فرمائی۔ جلنے والے جلے۔ اور کہا گیا کہ ؎ خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود ٭ چوں بیاید ہنوز خر باشد۔ مگر یہ جواب تھوڑی ہی ہے، مُنہ چڑانا ہے!۔

اس کے کچھ بعد کے فارسی شاعر اور وہ آگا فراد اہیں کہ فرماتے ہیں ؎

مرادِ لیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

مغلی دَور میں فارسی اور بڑھی۔ ہمایوں اُسے اہل زبان یعنی اصفہانیوں سے سیکھ کر ہند آیا۔ اکبر کا نورتن، فارسی اور فارسیوں سے چمکا۔ فیضی نے اُس سے فیض پایا۔ اور ابوالفضل پر بھی اُس کا فضل رہا۔ جہانگیر، تخیلات کا پُتلا اور گولستان الغیب کا حافظ ہے۔ مگر فردوسی کے اُس جام جہاں نمان (شہنامہ) سے بھی باتیں کرتا اور سُرور میں رہتا ہے۔ شاہجہاں صاحبِ ذوق ہے۔ شاہنامہ اُس کی صحبتوں میں پڑھا جاتا اور اُس سے مزا لیتا ہے۔ اورنگ زیب، عالم ہے۔ اُس کے وقت میں، یہ نامہ ہمارا سرنامہ بنکر عالمگیر ہوگیا۔ بہادر شاہ (معظم) بیدل کا شاگرد ہے اور فارسی کا استاد، اس کا زمانہ، شہنامہ کے اوج کا ہے۔ شاہی بزم میں، داستان سرا، اُس کی رزم پڑھتا اور دربار کو جوش میں لے آتا۔ جب سے صحبتوں میں اُس کے پڑھے جانے کا رواج پڑا۔ اور امیروں کی مجلسوں میں داستان سراؤں کا عہدہ بڑھا اور وہ عام ہوگیا

فرخ سیر سے محمد شاہ اور پھر شاہ عالم (ثانی) کے دور تک وہ جام جم، (شہنامہ) ہر وقت گردش میں اور ہمارا پیالہ بنا رہا۔!

اکبر ثانی کے زمانے میں شاہنامہ عروج پر تھا۔ توکل نے اسی دور میں اس کا خلاصہ نثر میں کیا اور شمشیر خانی اُس کا نام رکھا۔ پھر ایک ہندو بزرگوار منشی مول چند دہلوی نے اس نامہ کو اُردو نظم کا جامہ پہنایا۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ ایک دن ؎

بہم محفل آرا تھے ہنگام شب	مہیا تھے سامانِ عیش و طرب
وہ محفل تھی رشک بہار چمن	ہر اک لحظہ تھا ذکر شعر و سخن
تواریخ کا بھی جو مذکور تھا	تو پھر ہر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشا کتاب	عجب نظم دلکش ہے باآب و تاب
ولے ہر کسی کو میسر نہیں	یہ تاریخِ فرخ نہیں ہر کہیں
توکل کہ مرد سخن سنج تھا	کیا ترجمہ اس نے شہنامہ کا
لکھا نثر میں قصۂ مختصر	کہ احوال معلوم ہو سر بسر
یہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے	تمام اُسمیں احوال مرقوم ہے
یہ سُنکر برادر مرے مہرباں	سخن فہم و دانشور و نکتہ داں

کہ زور آور اُنکا جہاں میں ہے نام — بخلق پسندیدہ، مشہورِ عام

یہ بولے کہ اے منشی اس نامہ کو — تم اب ریختی کی زباں میں لکھو

کرو نظم ترتیب باآب و تاب — بنامِ شہنشاہِ گردوں جناب

خدا نے جسے شاہ اکبر کیا — خداوند اورنگ و افسر کیا

سُنا یہ سخن جب تو با صد طرب — وہیں کر کے شمشیر خانی طلب

ہُوا میں دل و جاں سے مصروفِ کار — لکھی نظم یہ دلکش و آبدار

مرتب یہ شہنامہ جب ہو چکا — کیا فکر تب سال تاریخ کا

تو پھر ہاتف غیب نے صبح دم — کہا، "قصۂ خسروانِ عجم"
۱۲۲۵ھ

یہ تھا اُس زمانے کا مذاق اور یہ تھی اس عہد کی شہنامہ پرستی!
دلّی کی بزم اٹھی تو لکھنؤ میں جمی۔ شاہنامہ وہاں بھی بدستور کھلا رہا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں میر حسن نے اپنی بے نظیر مثنوی لکھی تو شاہنامہ اُن کے سے بزرگوار کے بھی پیش نظر رہا۔ یہ حسن بھی اُسی شراب طوس سے مخمور ہیں۔ فردوسی کا پیالہ پیئے ہوئے اور اپنے گھر کی زبان لئے ہوئے اتنا ہوشیار دوسرا نظر نہ آیا۔ فردوسی اگر روانی میں اپنے "تو گفتی" کے مشہور فقرے سے زور آور مزا پیدا کر دیتا ہے تو حسن بھی اپنی

زبان میں اُس سے کام لیتے اور عجب حُسن پیدا کر دیتے ہیں۔ سنو۔ باغ کی تعریف میں ؎ کھڑے سرو کی طرح جتنے تھے جھاڑ

کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

یا شہزادے کے حمام کرنے کے بیان میں ؎

گیا حوض میں جب شہِ بینظیر پڑا آب میں عکسِ ماہِ منیر

وہ گورا بدن اور بال اُسکے تر کہے تو کہ ساون کی شام و سحر

یا بدر منیر کے کپڑوں اور اُس کے حُسن کی تعریف میں ؎

زبس موتیوں کی تھی سنجاف کُل

کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں تُل

فردوسی کی حمد مشہور اور ایک خاص قصہ کے ساتھ منسوب ہے۔ کہتے ہیں۔کہ۔ فردوسی کے مرنے پر اُس کی نماز جنازہ پڑھنے میں طوس کے ایک مشہور عالم، مولانا ابوالقاسم نے انکار کیا اور کہا کہ فردوسی عالم تھا مگر اس نے شاہان عجم کی مدح سرائی میں اپنی عمر گذار دی! اُسی شب کو مولانا نے خواب میں دیکھا کہ بہشت کا دروازہ کھُلا ہوا ہے اور فردوسی نہایت تحفہ لباس پہنے بہشت میں داخل ہُوا اور ایک

عالیشان محل میں جا بیٹھا۔ مولانا کو اس پر حیرت ہُوئی۔ فردوسی سے اُنھوں نے پُوچھا کہ۔ آج یہ درجہ کس صلے میں تم کو نصیب ہُوا؟ فردوسی نے جواب دیا کہ۔ اُن دو تین شعروں کی بدولت، جو ہم نے حمدِ باری میں نظم کئے تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں۔ ؎

ستائش کنم ایزدِ پاک را　　که دانا و بینا کند خاک را
به مورے دہد مالش نرّہ شیر　　کند پشّہ بر پیل جنگی دلیر
جہاں را بلندی و پستی توئی　　ندانم چۂ؟ ہر چہ ہستی تُوئی

حسن کے سامنے شاہنامہ کی یہ حمد ہے۔ وہ گو اصل مضمون وہیں سے لیتے ہیں مگر دیکھو اپنی نظم میں کس طرح اُسے رونق دیتے اور اس مضمون کو کیونکر اپنا کر لیتے ہیں۔ سنو۔

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم　　جھکا جس کے سجدہ میں اوّل قلم
سرِ لَوح پر رکھ بیاضِ جبیں　　کہا دوسرا کوئی تجھسا نہیں
قلم پھر شہادت کی اُنگلی اُٹھا　　ہُوا حرف زن یوں کہ ربِّ عُلا
نہیں کوئی تیرا۔ نہ ہوگا شریک　　تری ذات ہے۔ وحدہٗ لاشریک

وہی سب سے اول ہے اور سب سے بیش
ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش

چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گُل
کہ مشتاق ہیں جسکے یاں جزو کُل

وہ ہے مالک ملک دُنیا و دیں
ہے قبضہ میں اُسکے زمان و زمیں

سدا بے نمودوں کی اس سے نمود
دل بستگاں کو ہے اس سے کشود

نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے
وہ کچھ شے نہیں، پر ہر اک شے میں ہے

نہ گوہر میں ہے وہ۔ نہ ہے سنگ میں
ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

وہ ظاہر میں ہر چند۔ ظاہر نہیں
یہ ظاہر کوئی اس سے باہر نہیں

تامل سے کیجئے اگر غور کچھ
تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ

اُسی گُل کی بُو سے ہے خوشبو گلاب
پھرے ہے لئے ساتھ دریا حباب

پر اُس جوش میں آگے بہتا نہیں
سمجھنے کی ہے بات، کہتا نہیں

اس بے نظیر مثنوی کے مزے میں بڑے بڑے مست رہے۔ اور اُس کے بعد ہی ہمارے یہاں داستان سرائی کا چسکا پڑ گیا اور وہ عام ہو گیا۔ بدر منیر سنہ ۱۱۹۹ھ میں بزمانہ آصف الدولہ تصنیف ہوئی (۵ برس مثنوی یادھر دل فدا۔ از مرزا قتیل، تاریخ تصنیف ہے) اس کے تیس ۳۰

چالیس سال بعد یعنی نصیر الدین حیدر (شاہ اودھ) کے زمانہ میں نسیم نے اپنا گلزار لگایا اور اُس کے گل بکاؤلی نے ہماری آنکھوں کو کھولدیا۔

یہ دونوں مثنویاں، شاہنامہ کے بعض فسانوں کا چربا نظر آتی ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ اس نامہ کا رنگ ان میں بھی بھرا دکھائی دیتا ہے۔ حسنؔ، اپنی اس داستان فراق کو وصال پر ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

اُنھوں کے جہانیں پھرے جیسے دن ہمارے تمھارے پھریں ویسے دن
ملیں سب کے بچھڑے الٰہی تمام بحق محمدؐ علیہ السلام

ہمارے پنڈت دیا شنکر (نسیم)، بھی فراق و وصال کا ایسا ہی قصہ سناتے اور اسکے ختم پر کہتے ہیں ؎

جس طرح اُنھیں بہم ملا یا
بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

لکھنؤ کا دربار بھی شہنامہ کے لئے دُربار رہا ہے۔ اور تو اور شاہ نصیر الدین حیدر تک نے دلّی کا شاہانہ رنگ قائم رکھا۔ بلکہ اسے کچھ اور شوخ کر دیا۔ شاہنامہ کے نسخے ہزاروں دے کر اُس نے لکھوائے، عام کئے اور ہمارے ہاتھوں تک پہنچا دئے اور پھر وہ ہمارے گھروں کا

چراغ بن گئے۔ بلا تشبیہ، قرآن کریم کے بعد صرف اسی کتاب عجم کو وہ رتبہ حاصل ہوا کہ بڑے بڑے خطّاطوں نے فخریہ اسے تحریر کیا، وہ مذہب بنا اور اس کا ایک ایک نسخہ ہزاروں میں ہدیہ ہُوا۔

شاہنامہ کا یہاں عام ہونا تھا کہ اہل مذاق اُس کی طرف جُھکے اور اسکی داستانوں سے اپنی زنبیلیں بھرنے لگے۔ مثنوی بے نظیر اور گلزار نسیم کا حال اوپر گذر چکا۔ وہ نظم کا حصّہ تھا۔ اب نثر نے بھی دو قدم آگے بڑھایا۔ زبان کے اُسی چٹکلے اور اُن مثنویوں کے مزے نے فسانۂ عجائب کا سا لطیف قصہ ہم کو سُنایا۔ پھر میر حمزہ کی داستان سے ہم کو ملایا۔ اور طلسم ہوش رُبا اور بوستان خیال تک ہم کو پہنچایا۔ ان کل قصّوں اور اس وقت اور اُن کے بعد سے افسانوں میں شاہنامہ کے اکثر فسانوں کا پرتو نظر آتا اور ہند کی زمین پر بھی وہ چمک جاتا ہے۔

لکھنؤ کا وہ زمانہ (اخیر شاہان اودھ) طرح طرح کی حکائتوں کے سننے سنانے اور اُن سے لطف اُٹھانے کا زمانہ تھا۔ پرانی فسانہ گوئی بیکار و بے مزا ہوئی تو 'مذہبی قصّوں' کا وقت آیا۔ یہ باکار اور ہماری ذہنیت سے قریب تر تھے۔ اس مذاق نے ہمارے یہاں مرثیہ گوئی

کی بناڈالی۔ اُردو نظم کی یہ صنف لکھنؤ کا حصّہ بنی۔ بڑے بڑے مرثیہ گو پیدا ہوئے۔ یہ زمین بھی خوب پھولی پھلی اور آخر انیسؔ کے زورِ طبیعت نے

اسے بات میں آشماں کر دیا

میر حسنؔ کے بعد بھی شاہنامہ ان کے خاندان میں برابر زیرِ مطالعہ رہا۔ میر انیسؔ کے مرثیوں کی بیشتر لڑائیاں، شاہنامہ کی جنگوں کی تصویر اور اُن کا جواب نظر آتی ہیں۔ میر نواب مونسؔ (برادرِ خرد و شاگردِ انیسؔ) بھی فردوسیؔ کو سراہتے ہیں۔ مگر شاہنامہ، دُنیوی بادشاہوں کا فسانہ ہے اور مرثیہ ہمارے دینی سرداروں کا، کارنامہ۔ اس لئے اُن (مونسؔ) کا بیان فردوسیؔ کے کلام پر سبقت چاہتا ہے۔ اس خیال کو وہ مرحوم اپنے ایک مرثیہ میں یوں نظم فرماتے ہیں ؎

ہاں[1] اے قلم ثنائے علمدارِ شاہ لکھ | شان و شکوہِ رایت[2] گیتی پناہ لکھ
وصفِ ہنر بر خسرو انجم سپاہ لکھ | شمشیر بن کے معرکۂ رزمگاہ لکھ

---

[1] میر انیسؔ اور انکی تقلید میں میر مونسؔ کے یہاں جنگ کربلا کا نقشہ بیشتر ایرانی زمین پر کھچتا اور شاہنامہ ان دونوں حضرات کے پیش نظر رہتا ہے۔ اسلئے جبتک فردوسی کا کلام یا حضرت ہوان بزرگواروں کے مرثیے کیا مزا دے سکتے ہیں۔ شہنامہ میں جنگ رستم و اسفندیار پڑھنے کے بعد مونسؔ کے اس مرثیہ کا مطالعہ کرو۔ [2] رایت بمعنی علم۔

تیغ علیؑ کی تجکو قسم، دم نہ لیجیو

جبتک نہ لاکھ سر ہوں قلم، دم نہ لیجیو

اولادِ پنجتنؑ کی لڑائی پڑھوں جہاں | بھولے سے بھی سُنے نہ کوئی جنگ ہفتخواں[1]

افسانہ ہوئے رستم و دستاں کی داستاں | دکھلائے ذوالفقار علیؑ کی بُرش زباں

عالم کے حاسدوں کا جگر غم سے خوں رہے

فردوسی بلند سخن سر نگوں رہے

مٹ جائے شاہنامہ رنگیں سخن کا رنگ | جمنے نہ پائے رستم و رئینہ تن کا رنگ

دکھلاؤں غزوۂ شہِ خیبر شکن کا رنگ | جھومے ہر ایک شخص یہ ہو انجمن کا رنگ

دست خدا کی ضرب کا، سب ڈھنگ دیکھ لیں

خیبر میں جو ہوئی تھی، وہی جنگ دیکھ لیں

کلام یعنی تصانیف مختلف وجہوں سے شہرت پاتے اور زندہ رہتے ہیں۔ نصاب و درس کے علاوہ ملک و قوم کی وقتی ضرورتیں اور اُن کی ذہنیتیں بھی اُنھیں جلائے رکھتی ہیں۔ مگر ادھر نصاب و درس ختم و بند ہُوا۔

---

[1] ہفتخوان رستم مشہور ہے۔

ضرورتیں پوری ہوئیں یا ذہنیتیں بدلیں اور وہ تصنیفیں بھی گم ہوگئیں۔ یہی چیزیں موسمی کہلاتی ہیں۔ رُت بدلی اور وہ ہوا ہوئیں۔ لیکن دُنیا کی واقعی کتابیں، گمنام نہیں ہوتیں۔ اسلئے کہ وہ موسمی نہیں بلکہ سدا بہار ہوتی ہیں!

شاہنامہ نوسو برس کا پرانا ہے۔ ایران اور فارسی زبان میں انقلاب آئے۔ تبدیلیاں ہوئیں، مگر یہ کارنامہ، اسلئے سلامت رہا کہ وہ حقیقت نامہ، تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت میں فارسی یہاں مر چکی یا ماری جا رہی تھی۔ ملک نہ فارسی داں باقی رہا تھا اور نہ شاہنامہ ہمارے مدرسوں میں کھلا ہوا تھا۔ مگر فردوسی اب بھی جی رہا تھا۔ اس کا کلام زندہ نہ ہوتا تو ملک میں چھاپے کے آنے کے ساتھ ہی وہ یہاں کے چھاپے خانوں کا سرمایہ نہ بنجاتا۔

یہ صحیح۔ لیکن افسوس کہ شاہنامہ اس وقت ملک میں ارزاں و عام ہوا جبکہ ہمارے قوا بیکار و معطل ہو چکے تھے۔ اسلئے اس نامہ عجم، سے ہم کو وہ فائدے حاصل نہ ہوسکے جو اُسکا مقصود تھا۔ عالمگیر کے بعد اس ملک کی حالت محتاج بیان نہیں۔ اس وقت شاہنامہ

بھی زیادہ زور دار کوئی کلام[1] ہمارے سامنے ہوتا تو وہ بھی ہم پر اثر نہ کرتا۔ ایسے کمزور دل و دماغ، نوش دارو، اور جواہر مہرہ سے بھی اصلی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لئے شاہنامہ ہمارا درماں نہ بن سکا۔ اُسکی صرف وہ داستانیں اور خالی وہ قصے ہم پر قبضہ کر سکے جو اُس صدی، کے ہندی دماغوں کو مرغوب تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری اُردو داستان سرائی (وہ نظم ہو یا نثر) شاہنامہ کی مفید و باکار باتوں کو چھوڑ کر صرف اُن حکایتوں سے کھیلتی رہی، جو اُس 'قصۂ عجم' کا غیر ضروری حصہ ہیں۔

بہرحال، 'شاہنامہ' ہم پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کی مانگ عام تھی۔ اسلئے اس کے چھاپنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی فکر ہونے لگی۔

۱۸۰۰ء کے بعد ہی ہندوستان میں چھاپہ آیا۔ کلکتہ نے اسمیں پیش قدمی کی اور مفید کتابوں کے چھاپنے کا سامان ہونے لگا۔ اُسوقت تک یہ نامہ یہاں قلمی، گراں اور امیروں کے سوا دوسرے شوقینوں کی دسترس سے باہر تھا۔ اسلئے ملک میں اس کے اثر اور اسکی مانگ کو

---

[1] مثال کے طور پر انیس کا کلام موجود ہے۔ اُس سے بھی ملک نے وہ فائدہ نہ اُٹھایا جو اُن کے سے شاعر و معلم کا اصل مقصد تھا۔!

دیکھکر کلکتہ کے ایک مطبع نے اُسے شائع کرنا اور اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ انگریز، تاجر ہیں، اپنے فائدے پر نظر رکھنے والے اور ہوشیار۔ اُس زمانہ میں یہاں (کلکتہ) یہ تین صاحبان، لِمسڈن، ہرنگٹن اور مڈلٹن اپنے علمی ذوق میں مشہور تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے شاہنامہ کے مختلف قلمی نسخے فراہم کرکے اُن سے شاہنامہ کا ایک خاص نسخہ ترتیب دیا۔ وہ کلکتہ کے ایک مطبع سے ۱۸۱۱ء میں شائع ہو کر عام ہُوا۔ اسی کلکتیا مطبع کے شاہنامہ کی وہ نقلیں ہیں جو بعد کو بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ کے چھاپہ خانوں میں چھپیں اور سستی بکیں۔

کلکتہ کے اُس مشہور نسخہ میں شاہ منوچہر کی زبان سے (اپنے بیٹے نوذر کو نصیحت کرتے وقت) یہ مزیدار شعر بھی نظر آتا ہے ؎

کنوں نو شود در جہاں داوری
کہ موسیٰ بہ آمد بہ پیغمبری

یہی نہیں بلکہ سکندر و دارا کے نامہ و پیغام کے سلسلہ میں یہ پُرلطف اشعار بھی دکھائی دیتے ہیں ؎

ہُماں از بر و خیر و دانش قضیب
نوشتہ بر آں بر محب الصلیب

نشستند واورا بہ آئیں بہ خواست　　　بہ رسم مسیحا و پیوند راست

بہ دارا روندہ وسوگند خورد　　　بہ دینِ مسیح و بہ تیغ نہ بُرد!

مگر اس شاہنامہ کے مرتب ہمارے ان مسیحی دوستوں کو اُس وقت اتنا یاد نہ رہا کہ منوچہر کا زمانہ حضرت موسےٰ سے بہت پہلے ہے۔ اور حضرت عیسےٰ، سکندر و دارا کے تین سو برس بعد پیدا ہوئے ہیں!۔ فردوسی کی زبان وکلام کا آشنا ایسے (الحاقی) شعروں کو اس شاہنامہ میں دیکھ کر بے اختیار ہنس دے گا!

ضروریات وسیاسیات کے آلٹر (قربانگاہ) پر صداقت ہمیشہ صدقہ کی گئی ہے! کتنا درست فقرہ ہے، اور یہاں کس درجہ چسپاں! اللہ رے تمھارے خدائے سخن کا وزن واثر کہ اُس کی زبان سے البرز (ایران کا مشہور پہاڑ) پر بھی تجلّی طور دکھائی جاتی اور (حضرت) مسیح کو تازہ حیات دئے جانے کی تدبیر کی جاتی اور شاہنامہ کے ورقوں پر اُن بزرگوار کی تصویر یوں کھینچی جاتی ہے!!

دوسرا حصّہ
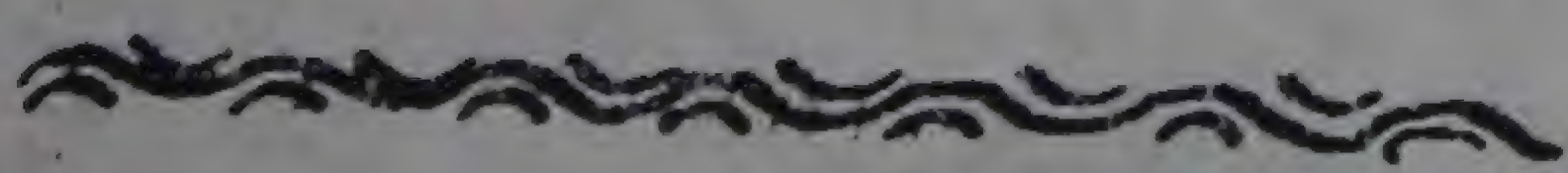
چنیں داد پاسخ کہ دانائے چیں
یکے داستانے زِ دست اندریں (فردوسی)

شاہنامہ پر بیرونی اثر

زندہ ملک، زندہ قومیں اور زندہ انسان اپنے گرد و پیش کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ فردوسی بھی زندہ تھا اسلئے ملک کے اندرونی و بیرونی اثروں سے اُس کا دُور رہنا محال تھا۔ ایران سے ملے ہوئے کئی ملک ہیں۔ عربستان، ہندوستان، ترکستان اور چینستان۔ وہاں کی معاشرت و تہذیب کا فارس پر اثر پڑا اور فردوسی بھی اُن سے متاثر رہا۔ لیکن اس کے شاہنامہ کے لئے نہ زمین عرب موزوں تھی، نہ زمینِ

ہند کہ وہاں کی گذشتہ روائتوں سے وہ اپنی تاریخ عجم کو مفید و منظم بنا سکتا۔ شاہنامہ میں جس وقت کے قصوں اور جنگوں کا بیان ہے۔ عرب اس وقت لایعنی تھا اور ہند بے معنی۔ اسلئے اُسے نیم مہذب ترکستان اور مہذب چینستان سے واسطہ رکھنا تھا۔ حکمتِ چین مشہور اور وہاں کے قدیم قصے اور پُراسرار حکایتیں معروف تھیں اس وجہ سے اس کتاب عجم کا ایک اچھا حصہ قدیم چینی مذہبی و نیم مذہبی روایتو نکا نگارخانہ بنگیا۔ اسکے علاوہ شاہنامہ چونکہ ایرانی و تورانی جنگوں کا مرقع اور اصل رستم کا کارنامہ ہے، اس لحاظ سے اُسے اپنے اس ہیرو کا خیال رکھنا ضرور تھا۔

رستم سیستانی ہے اور اس کا خاندان چینی و سیبنی۔ سین دخت (بانوئے چین) اُس کی دادی ہے۔ اس خیال سے فردوسی اپنے ہیرو کی ہر ادا، چینی دکھاتا اور اُس زمین پر اس کا نقشہ کھینچتا ہے جو اپنی رنگینیوں کے لئے مشہور رہی ہے۔ نامہ نگاری کا یہ ایک قابلِ آفریں نمونہ ہے۔ فردوسی نے رستم کو یوں پیش کرکے اپنے دماغ و قلم کا رنگ و زور دکھا دیا۔

دُنیا جانتی ہے کہ رستم محض خیالی و فرضی بشر نہ تھا اسلئے کچھ دن ضرور جیتا۔ مگر فردوسی کے قلم سے وہ حیاتِ ابدی پا گیا۔ اُس کی آدھی عُمر اپنے اس ہیرو کی خدمت میں گذر گئی۔ کہتا ہے ؎

کہ یک نیمہ از عُمرِ خود گُم کنم جہاں را پر از نامِ رستم کنم

کہ رستم سرے بود در سیستاں من آوردم او را دریں داستاں

یہ کیوں؟ محض اسلئے کہ ایرانی و تورانی جنگ بہ غیر اُس (رستم) کے نہ مزا دیتی اور نہ سر ہوتی۔ اور جب رستم یوں میدان میں آگیا تو اسکی تصویر چینی پردوں پر کھچی اور شفاف ہو گئی۔ فردوسی اپنے اس بیان کے شروع میں ایمان داری کے ساتھ بتا دیتا ہے کہ اُسکے ہیرو کا خاکہ اور پتلا کس زمین کی مٹی کا ہے۔ سُنو۔ ؎

چنیں داد پاسخ کہ دانائے چین

یکے داستانے زِ دستِ اندریں

یعنی یہ باتیں ایک چینی خزانہ (کتاب) سے لی گئی ہیں!

اس مضمون کی تمہید میں فردوسی کے شاہنامہ کے ماخذ کو جہاں بتایا گیا وہاں یاد دلا دیا گیا ہے کہ۔ بُستان نامہ اور گرشاسپ نامہ وغیرہ

کے ساتھ چینیوں کے قدیم مذہبی و نیم مذہبی قصے بھی اُس کے پیش نظر تھے۔ فینگ شن ان (Feng Shen Yen) نام چین کی مذہبی و نیم مذہبی جنگوں کے بیان میں (بہ زبان چینی) ایک قدیم (بارہویں صدی قبل المسیح) مثنوی ہے جس میں وہاں کے ہیرو اور گنگے ناموروں کا بہ وضاحت ذکر ہے۔ یہ مثنوی چین کا گویا شاہنامہ ہے اسلئے وہاں بیحد مقبول تھی۔ علاوہ اور چینی تصنیفوں کے اس مثنوی میں خاص طور پر اُن ناموران چین کی تصویریں یوں کھچی دکھائی دیتی ہیں کہ اگر شاہنامہ کے ہیرو، فارسی ناموں کے ساتھ پیش نہ ہوں تو دونوں ایک معلوم ہوں۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اور چینی تصنیفوں کی طرح یہ مثنوی بھی پہلوی میں ترجمہ ہوئی اور فردوسی کے پیش نظر تھی۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے مواد سے وہ زندہ کن عجم اچھی طرح اور یوں واقف تھا کہ چینی ناموروں کو ایرانی ہیروؤں کے قالب میں اس کامیابی سے ڈھال کر انھیں ایسی حیات تازہ دے گیا۔

ایشیا میں ریسرچ یعنی کرید کا مادہ ہمیشہ کم رہا ہے۔ ہندبہ ایں علم و ہوش جب فن تاریخ سے بے خبر رہا تو ایسی تحقیقات میں جو حقیقتاً فلسفہ تاریخ ہیں،

اُس کی قدرت سے باہر تھیں۔ عربوں میں بے شک اس کا مادہ تھا۔
اور انھیں اُطلبُوا العلم ولو کان باالصّین (یعنی علم حاصل کرو، گرچہ
وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو) کا سبق بھی دیا گیا تھا۔ لیکن ایسے علم
کے دوسرے معنی اُنھوں نے لئے۔ اور اپنے عروج اور دماغی صلاحیت
کے زمانہ میں بھی وہ زیادہ تر، خالص مذہبی معاملات میں مصروف رہے۔
علم سینیا[۱] (Sinai) یعنی علوم و فنون متعلق بہ چین پر وہ
کیا نظر کرتے۔ رہے ایرانی۔ وہ اس کے اہل ہو سکتے تھے۔ شاہنامہ
ان کی چیز تھی۔ اور فردوسی کا یہ شعر ؎

چنیں داد پاسخ کہ دانائے چین
یکے داستانے زِ دست اندریں

اُن کے سامنے تھا۔ اس کے معنی و مطلب کے سمجھانے میں وہ اپنی
بغل کے ملک (چین) کی خاک چھان سکتے اور اس کی تفسیر میں دریا
بہا دے سکتے تھے۔ لیکن نقلیات میں وہ عربوں کے مقلد و نقال بنے

[۱] سینیا۔ یونانی میں چین کو کہتے ہیں۔ عربوں نے اس لفظ کو 'سین' بنا دیا۔

اور عقلیات میں آرسطو کے شاگرد ہو کر صرف اس فلسفہ سے کام لیتے رہے۔ جس کی بنیاد زیادہ تر تخیلات پر ہے۔ دماغ کی اس کروٹ (Stress) نے انھیں سُلا دیا۔ شاہنامہ کا ازبر کر لینا اور اُس سے ایک فوری ہیجان و جوش میں آجانا اُنھوں نے کافی جانا۔ اور اپنی کتاب کے فلسفہ کو بھول گئے۔ اُن کے مختلف مسلک و اعتقاد اور اُن کی اقسام طرح کی شاعری بھی زیادہ تر ہیجانی (Emotional) تھی اسلئے وہ شاہنامہ کی سی مسلسل و سنجیدہ تصنیف پر صبر کے ساتھ کیا غور کرتے۔ اور اسلئے فارسی تذکرے، عام طور پر، شعر و شاعری کی اُس بحث میں پڑ گئے جو سطحی و لباسی تھی۔ اس کی رُوح پر نہ نظر گئی اور نہ اس وقت جا سکتی تھی۔ موجودہ ہند، ابتک اسی فارسی شاعری، فارسی تذکروں اور فارسی دماغوں کا مُرید و مقلد ہے۔ اسلئے ہمارے تذکروں میں ایسی چیزوں خصوصًا شاہنامہ کے اصلی حُسن اور اُسکی غرض و غایت کی تلاش بے سُود ہے۔ وقت آتا ہے کہ ہمارے اہل قلم ادھر بھی متوجہ ہوں اور نئی تحقیقات سے بھی اپنی کتابوں کو بھر دیں۔ اِس سو، ڈیڑھ سو برس میں یورپ نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔

یورپین، علوم کی تحقیقات میں لگے۔ اور علم سینیا (چینی علوم) سے بھی ایک حد تک واقف ہوگئے۔ قدیم چینی علوم کی تلاش ہوئی۔ اس ذوق میں چینی شاعری کے سمجھنے کا بھی اُنھیں شوق ہُوا۔ وہ چین گئے۔ چینی سیکھی۔ وہاں سے خزانے لائے۔ اور ہزاروں برس قبل مسیح کے وہ چینی دفینے، پیرس و برلن کے سیفوں میں رکھے گئے۔ انمیں فینگ شن ان (Feng Shen Yen) کی سی وہ مثنوی بھی ہے جسکا اوپر ذکر ہوچکا۔ یہ ترجمہ ہوئی اور حاشیوں کے ساتھ شائع کی گئی۔ اس تصنیف نے

چنیں داد پاسخ کہ دانائے چین
یکے داستانے زِدست اندریں

کے معنی سمجھادئے اور نوسو (۹۰۰) برس بعد فردوسی کے کلام کی صداقت عیاں ہوگئی! اس چینی ذخیرے اور خصوصًا اس چینی مثنوی سے۔ جستہ جستہ اور صرف وہ باتیں اِسوقت پیش کردی جائیں گی جو ہمارے شاہنامہ میں بھی نظر آتی اور جو اس (شاہنامہ) کے پڑھنے والوں کے دماغ میں حاضر اور دلچسپ ہیں۔

(۱) گیاہ حیات

(زندگی کی جڑی) یہ اعتقاد قدیم سے ہے کہ دُنیا کے کسی حصّہ میں آبحیات اور گیاہ حیات موجود ہیں۔ جن کے استعمال سے آدمی مرتا نہیں۔ اکثر بادشاہوں نے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن نہ مل سکی۔ فردوسی کہتا ہے کہ نوشیرواں نے بھی اپنے ایک حکیم برزو (بوذر) کو اُس کی تلاش میں ہند بھیجا۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہُوا۔ دوسری جڑی لے آیا۔

گیاہا ز خشک و ز تر بر گزید ۔۔۔ ز پژمردہ و ہر چہ رخشندہ دید
ز ہر گونہ سُود ازاں خشک و تر ۔۔۔ ہمی بر پراگندہ بر مردہ برا

اور مسیو ڈولنڈ (Mosio Dolland) کہتے ہیں کہ ۳۰۰ قبل مسیح، فغفور ڈوتی (Tsin Tsue) نے ایسی ہی ایک گیاہ کے لئے دُنیا چھان ماری۔ مگر نہ ملی (مائتھ آف چائینا صفحہ ۱۱۴-۱۱۶) یہاں اتنا یاد کر لینا چاہئے کہ ہند میں بھی یہ خیال و اعتقاد رہا ہے۔ ہمارے یہاں اُس جڑی کا نام سجیون بوٹی ہے۔ اور شاید یہ وہی جڑی ہے جو دکھن کی لڑائی میں، لچھمن جی کے زخمی ہونے پر، ہنومان اُن کے

لئے ایک پہاڑ سے لائے اور اُس کی بدولت وہ (لچھمن) جی گئے!

(۲) ریشم کا کیڑا

شاہنامہ کہتا ہے کہ آردشیر کے زمانہ میں ایک غریب پسر ہفت وا
نام اس کیڑے کی بہ دولت امیر کبیر ہو گیا اور بادشاہ کا مقابلہ کرنے لگا۔
اور کرمان[1] پر قبضہ کرنے کے بعد سے

زشہر کجاراں بہ دریائے پارس

تک اُس نے اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہ کیڑا چین کا تحفہ بھی ہے۔ مسیو دی غروت (De Groot)
ناقل ہیں کہ۔ چینی قصوں میں اس کیڑے کا تفصیل سے حال موجود ہے
اور وہ حکایتیں قدیم اور مسیح سے کئی صدی قبل کی ہیں۔ ایرانی روایت
کے موافق یہ کیڑا وہاں ایک سیب کے اندر سے نکلا اور چین میں ایک
شیشے کی دو پرتوں سے! (دی غروت صفحہ ۵۷)

(۳) کارنامۂ گرشاسپ

شاہنامہ میں ہے کہ یہ ایرانی ہیرو ایک جنگل میں کامک نام ایک قوی

---

[1] کرمان۔ کہتے ہیں کہ اس لفظ کرم (کیڑا) سے شہر کرمان بنا۔ یعنی کیڑوں والا شہر۔

ہیکل پرند کو مارتا اور داد لیتا ہے۔ اسی طرح، اِی (ننھو) نام ایک
چینی قدر انداز اپنے ملک میں ایسے ہی ایک زبردست چڑیا کا شکار
کرتا اور مرد بنتا ہے (ورنر Werner صفحہ ۱۸۱-۱۸۲) پھر یہی
گرشاسپ، ایک اژدہے کو مارتا اور خونخوار بھیڑئے پر ہاتھ صاف کرتا
اور ایک دریائی حیوان (گندریوا) کو اپنا نشانہ بنا کر نام پیدا کرتا ہے
تو وہ چینی اِی (ننھو) بھی اسی طرح کے جانوروں کو تہ تیغ کر کے
چین کا رستم بنتا ہے! (غرینٹ Granet De la Anciennes)

(۴) دیو سفید

شاہنامہ میں یہ حیوان رستم کا شکار ہے اور اُس کے جگر کا خون شاہ
کاؤس کے سے نابینا کو بینا کر دیتا ہے۔ رستم اس حیوان کو مار کر بادشاہ
سے عرض کرتا ہے کہ۔ ؎

زپہلوش بیروں کشیدم جگر
چہ فرماں دہد شاہ فیروز گر؟

دیو سفید کا پہلو چیر کر، اُس کا جگر نکال لیا گیا۔ حاضر ہے۔ اب کیا حکم
ہے؟۔ کاؤس کہتا ہے ؎

کنوں خونش آور تو در چشم من ہماں نیز در چشم ایں انجمن[1]
مگر باز بینیم دیدار تو کہ بادا جہاں آفریں یار تو

ہاں اُس کے خون کے قطرے ہماری آنکھ اور ہمارے ندیموں کی آنکھوں میں ڈالو کہ وہ روشن ہو جائیں اور ہم (سب) خدا کی حمد گائیں!

مگر وہی فرنچ مورخ و حکیم دی غروت (جلد ۴ صفحہ ۷۲) اس داستان کو ایک قدیم چینی حکایت سے بھی منسوب کر کے کہتا ہے کہ۔ انسان و حیوان کے جسم (vicera) میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو بیماریوں کی دوائیں ہیں۔ چینی، انھیں "شن" (shen) کہتے ہیں۔ دنیا کی اکثر چیزوں کی خاصیت اور ان کے فائدے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے یا تو اُن چیزوں کی اصلیت سے انکار کیا گیا اور انھیں محض فسانہ سمجھا گیا یا تہذیباً انھیں معجزہ (یعنی عام طور پر عاجز کر دینے والی! جسے اُسوقت دوسرا نہ کرسکے اور اس سے عجز ہو!) کہدیا گیا۔ شاہنامہ میں بھی اکثر ایسی باتیں ہیں جو یوں عجیب نظر آتی ہیں۔ اُن کی اصلیت

---

[1] ایک لڑائی میں دفعۃً سورج گرہن ہوگیا۔ گہن چھوٹا اور سورج نکلا تو کاؤس اور اس کے مصاحبوں کی نظر سورج سے لڑی۔ چکاچوند لگ گئی۔ اور اُنکی آنکھیں خیرا ہو گئیں۔

ومائیت نہ جاننے کی وجہ سے، سست دماغوں نے انھیں محض فسانہ کا لقب دیدیا۔ یہی باتیں اگر کسی مذہبی پیشوا سے منسوب ہوتیں تو وہ معجزہ قرار پا جاتیں!

یہاں ایک لطیفہ سنو! ہندوستان بھی ایسی چیزوں میں اندھا نہ تھا۔ ایران کے شاہِ کاؤس کی روشنیِ چشم، آفتاب کی دفعتہً چمک سے گم ہوئی۔ اور ہند کے سلطان زین الملوک کی آنکھیں، اپنے شہزادے تاج الملوک کو دیکھ کر، کمزور پڑیں۔ وہاں ایک حیوان (دیو سفید) کے جگر کے خون کی تلاش ہے۔ اور ہمارے یہاں زین الملوک کا ایک کہال (آنکھ بنانیوالا)، عرض کرتا ہے ؎

ہے باغ بکاؤلی میں ایک گُل
پلکوں سے اُسی پہ مار جھنگل!

اسلئے اب اُس گل (بکاؤلی) کی ڈھونڈھ ہے۔ تاج الملوک کسی طرح آخر اُس گل کو لاتا، بکاؤلی کے سے پھول کو بھی پاتا اور زین الملوک کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ یہ گُل، اصل لوٹس (Lotus) یعنی ہمارا کنول ہے جسکا شہد آنکھوں کو روشن کرتا اور ہمارا دل کھلاتا ہے!

ایک بات اور سنو۔ کنعان میں (حضرت) یعقوب کا نور بصر، فراق (حضرت) یوسف میں روتے روتے زائل ہو جاتا ہے۔ مگر ہوائے مصر مژدہ سناتی اور قمیص یوسف (جو زلیخا کو بھی یاد دلاتی اور بڑی بڑی کرامتیں دکھا چکی ہے) اسرائیل (یعقوب) کی آنکھیں روشن کر دیتی ہے۔ وَالقہ علی وجھہ فارتد بَصِیرا۔ وہ (قمیص) اُن کے چہرۂ مبارک پر ڈالدی گئی اور بینائی عود کر آئی!

اس احسن القصص (قصۂ یوسفؑ) اور پیراہن یوسف نے طرح طرح کے مضامین، استعارے اور کنائے پیدا کر دئے اور وہ ہمارے تیغ ادب کا جوہر بن گئے ہیں۔ مگر ہم کو کیا غرض کہ آنکھیں کھولکر کچھ پڑھیں اور ایسے قصوں کی تہ تک پہونچیں اور داستان کاوس، قصۂ زین الملوک اور اپنے پیر کنعاں، سردار یہود (حضرت) یعقوب کی سی مزیدار و پر حکمت حکائتوں سے سبق لیں اور سمجھیں کہ قدرت ہر جگہ ایسے ہی گل کھلاتی اور ہر شکل میں اپنی قدرت دکھاتی ہے!!

(۵) پیل سفید

شاہنامہ کہتا ہے کہ۔ رستم ابھی پورا جوان نہ ہوا تھا کہ۔ سفید

پیلِ سپیدِ سپہ بُد زبند
رہا گشت و آمد بہ مردم گزند

اُس کے شہر کے سرکاری جنگی فیل خانہ کا ایک سفید ہاتھی چھوٹ گیا اور آدمیوں پر ٹوٹنے لگا۔ رستم کو بھی خبر ہوئی۔ وہ ؎

ہمی رفت تازاں سوئے ژندہ پیل
خروشندہ مانند دریائے نیل

پہلوان اس طرح دوڑتا چنگھاڑتا جا رہا تھا کہ ؎

چو پیلِ دمندہ، مراورا بہ دید
بہ کردار کوہے براو بر دوید

ہاتھی اُس پر یوں جھپٹا جیسے ایک پہاڑ ٹوٹا۔ مگر نڈر ؎

تہمتن یکے گرز زد، بر سرش
کہ خم گشت بالائے کُہ پیکرش

پہاڑ سا ہاتھی دُہرا ہو گیا ؎

بہ لرزید بر خود، کُہِ بے ستوں
بہ زخمے بہ اُفتاد خوار و زبوں

بھر ایا، چکرایا، دھم سے گرا اور ٹھنڈا ہو گیا!

آب ورنر (Werner Page 283) کہتا ہے کہ۔ قدیم چین کے مذہبی قصّہ میں بھی یہی واردات نظر آتی ہے۔ وہاں ایک طرف سفید ہاتھیوں کا جھنڈ ہے اور دوسری طرف، سُرخ پوش نوجوانوں کا رسالہ۔ دونوں بھڑتے ہیں۔ ہاتھی مارے جاتے اور سرخ پوش میدان جیتتے ہیں۔

(۶) آگ میں امتحان

سیاؤش (پسر شاہ کاؤس) کی سوتیلی ماں سوداب، اُس پر عاشق ہوتی اور اُسے پکڑتی ہے۔ وہ نکل بھاگتا ہے۔ اپنا عیب ڈھانکنے وہ (سوداب) بادشاہ سے الٹی فریاد کرتی ہے۔ اُس کی بات نہیں سنی جاتی تو اور چرتوں سے کام لیتی اور کاؤس کو کسی طرح اُسکاتی ہے۔ بادشاہ کی آتش غضب آخر بھڑکی۔ لکڑی جلائی گئی اُس کی روشنی سے ؎ زمیں گشت روشن تر از آسماں

جہانے خروشاں و آتش دماں

سیاؤش بلا گیا۔ حکم ہوا کہ۔ اس آگ میں اُترو۔ بے گناہ ہو تو خاک کچھ نہ ہوگا۔ ورنہ راکھ ہو جاؤ گے۔ شہزادہ سر جھکائے کھڑا ہے۔ عرض کی کہ ؎

سر بُرّ ز شرم و تباہی مرا ست
اگر بے گناہم رہائی مرا ست

اور بسم اللہ کہہ کر اُس دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑا۔ اور ؎

ز آتش بروں آمد آزاد مرد
لباں پر ز خندہ و رخ ہمچو ورد

ہنستا بکستا نکل آیا!

غروب (Grube) ایسا ہی ایک قصہ مثنوی، فینگ شن ان (Fieng shan yan) سے فغفورِ چین، چو ونگ کا نقل کرتا ہو مگر کہتا ہے۔ کہ۔ وہاں فغفور کے شہزادے کے عوض اُس کا دوست چوکی (Chaoki) آگ میں کود کر شہزادے کی جان بچا لیتا اور اسکی سوتیلی ماں کو ذلیل کرتا ہے!

آگ کا ایسا کھیل پُرانے زمانہ میں اکثر کھیلا جاتا اور آزمائش کا یہ عجیب و گرم نسخہ تھا۔ ہمارے یہاں بھی سیتا جی اسی طرح آزمائی گئی ہیں۔ رام کو ایک دفعہ اُن پر کچھ شک ہوا۔ آگ میں ڈالی گئیں، بے لاگ نکل آئیں! بابل وغیرہ کے بھی ایسے ہی قصے مشہور ہیں۔

آتشِ نمرود بھی شاید اسی قسم کی کوئی آگ تھی جو حضرت ابراہیم پر گلزار ہو گئی۔ اور وہ معصوم، (قلنا) یَا نَارُ کُونِی بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰی ابراھیم کے زور سے ٹھنڈے اور سلامت رہے!

سمجھدار، ایسی پُر حکمت حکائتوں کے نتیجوں اور مورل کو دیکھتے ہیں۔ وہ ؂ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

پر نظر رکھتے اور محض اُن کے الفاظ پر نہیں جاتے ہیں! خیر۔ اب ذرا سیاوُش کے دلچسپ قصّہ کا سرا بھی سُن لو۔ اُس کی سوتیلی ماں سودابہ نے جب اُسے گھیرا اور وہ بھاگ نکلا تو اُس نے کاوُس سے الٹی شکایت کردی۔ بادشاہ کو تعجب ہوا۔ فوراً بیٹے کو بُلایا۔ اُسے بہ غور دیکھا۔ پھر سودابہ پر نظر کی۔ شہزادہ معمولی کپڑے پہنے تھا۔ اور وہ (سودابہ) بنی ٹھنی تھی۔ پکڑی گئی! کاوُس نے دیکھا کہ وہ عطر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مگر ؂

نہ دید از سیاوش چناں نیز بُوئے
نشانِ بسودن نہ دید اندر اُوے

یہ سادا سُودا ہے۔ بادشاہ سمجھ گیا۔ مگر ٹال گیا۔

مصر سے بھی ایسی ہی خبر آئی ہے۔ (حضرت) یوسف، زلیخا کا قصہ کون نہیں جانتا۔ عورت جوش میں آتی، وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابُ دروازے بند کرتی اور (حضرت) یوسف سے کہتی ہے۔ هَيْتَ لَكَ لے آؤ! پیغمبر (یعقوب) کا بیٹا جھجکا۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا وہ لپکی اور یہ نکلے۔ یہاں بھی سودابہ کی طرح عزیز مصر سے الٹی شکایت ہوئی۔ دونوں دیکھے گئے (حضرت) یوسف کا کرتا (قمیص) پیچھے سے پھٹا تھا۔ عزیز سمجھ گیا۔ کہا کہ۔ اللہ رے مکر۔ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ! ایسوں کے فریب سے پناہ بخدا! نہ معلوم اُس وقت کا ایران اپنے سیاوش کے قصے سے کیا سبق لے سکا؟ مگر ہمارے یہاں مصر کی اس واردات کو پیش نظر رکھ کر بڑے بڑے درس دئے گئے!

شاہنامہ میں سیاوش کا حال دیدنی ہے۔ وہ آگ کی مصیبت سے چھوٹا تو سودابہ کے اور جالوں میں پھنسا۔ رانی کیکئی نے، اجودھیا (کوسل)، سے رام کو نکلوایا۔ اُنھیں بن باس ہوا۔ دکھن پہونچے۔ وہاں لڑے اور لڑائی جیتے۔ اور پھر گھر آ کر راج، رجتے رہے! ایران میں سیاوش، سودابہ کے چیتر سے، افراسیاب کے مقابلہ پر، توران بھیجا

گیا۔ جنگ ہوئی۔ مگر اس جنگ کو اُس نے صلح اور ایک عہد نامہ سے بدلا۔ کاؤس نے ایسے عہد کو پسند نہ کیا۔ سیاؤش نے پیمان شکنی گوارا نہ کی۔ باپ (کاؤس) سے ناراض ہوکر، مردانہ وار، افراسیاب پاس چلا گیا۔ وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس تورانی بادشاہ (افراسیاب) کا داماد بنا۔ اُسے ایک مُلک دیا گیا۔ اور وہاں شاہی کرنے لگا۔ سچائی اور ہمت کا اُسے بدلہ مل گیا۔ مصر میں بھی یہی ہُوا۔ زلیخا نے (حضرت) یوسف کو آخر پھنسایا۔ قید ہوئے۔ رہے۔ کڑیاں جھیلے۔ چھوٹے تو افسر مصر اور زلیخا کے سرتاج بنے۔ نیکی کا پھل ملا۔ کیا اچھا سودا ہوگیا! مصر اپنے یوسف کو جلد بھولا۔ مگر ایران نے اپنے سیاؤش کو یاد رکھا۔ اسکی ایمانداری، مردانگی اور پھر افراسیاب کے ہاتھ اسکے بلا وجہ قتل کا وہاں مدتوں چرچا رہا۔ دس دنوں تک سالانہ ایک میلا ہوتا۔ جہاں سیاؤش کا رجز پڑھا جاتا اور یوں عجم تازہ دم رکھا جاتا۔ ورنر کہتے ہیں کہ چین بھی تاچی (Ta chi) کے بعد مدتوں اُس کی یاد میں سالانہ ایک میلا ہوا کرتا تھا اور وہ ایک متبرک تقریب سمجھی جاتی تھی اور تے سُوئی (Tai Sui) کے سے قومی ہیرو کا نام بھی مدتوں وہاں روشن

رہا۔ ۶۱ ۱۰۰۰ء تک (یعنی جب کہ شاہنامہ وجود میں آکر ایرانیوں کی زبان پر تھا) یہ رسم جاری رہی (ورنر صفحہ ۱۹۶-۱۹۴)

آیران پر مسلمانوں کے قبضہ کے بہت بعد تک یہ سیاوشی میلاوہاں جاری رہا لیکن حسن صباح (۴۶۴ھ) کے وقت اس کا بازار سرد پڑا۔ اور حسنیوں (*Hassnians*) اور فدائیوں کے زمانہ میں اسکے عوض آیران میں عشرہ محرم قائم ہوگیا۔ اس کے لئے بھی دس دن خاص بنتے۔ اسمیں کربلا کے معرکے تازہ ہوتے اور وہ عجمیوں کی جنگی اسپرٹ کو ابھارنے کے ساتھ اخلاق و معرفت کا سبق بھی دیتے رہتے۔ سیاوش ایرانیوں کا صرف ایک شہزادہ تھا اور (امام) حسین، اُن کے سردار دین و دُنیا کے فرزند، خاندان کسریٰ کے مُردہ نام کو زندہ کرنے والے اور شہر بانو کے سرتاج تھے، وہ (ایرانی)، ان پر کیونکر فدا نہ ہوتے عجمیوں نے اُن کے کارناموں کو سراہا اور اپنے ملک میں حضرت کی یادگار قائم کرکے عرب و عجم کو ایک کرنا چاہا۔

وہ زمین (ایران) اپنے درفش کاویانی کو بھولی نہ تھی۔ اور کیوں کر بھولتی۔ وہ ذہاک تازی کے خلاف اُڑ چکا اور مذہبی جنگوں میں تورانی

زمین پر اپنے جھنڈے گاڑ چکا تھا۔ منوچہر اُسے نکال چکا اور میدان جنگ میں ؎ سراپردۂ شاہ بیروں کشید

درفش ہمایوں بہ ہاموں رسید

اس کا زرریز پھریرا، اُڑ اُڑ کر آسمان کو دبا چکا اور سورج کو گہنا چکا تھا۔ جنگ عرب و عجم میں وہ ٹھنڈا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا اور کیانیوں کا نشان مٹ چکا تھا!

قومیں اپنے قومی نشانوں سے جیتی اور ورر رہتی ہیں۔ ایرانی اسے سمجھے اور اب جنگ کربلا کے سپہ دار و علمدار (حضرت) عباس کے نام سے، خیبر و خندق کے یادگار علم کو بلند کر کے، ان عربی غزووں کو یاد دلاتے رہے! وہ رائت میدان میں آیا تو، عجمی ٹوٹے، درفش کاویانی کو بھولے اور اپنے اس نئے قومی نشان کی شان دیکھ کر وجد میں (گویا) پکار اُٹھے۔ کہ۔

رَفْرَفِي يَا رَايَة فَوْقَنَا رَفْرِفِي وَاجْمَعِينَ تَحْتَ ظِلِّكِ

اے نشان اُڑ اُڑ، ہمارے سروں پر اُڑ۔ اور ہمکو اپنے پردوں میں لئے رہ!

بِيكِ نَتَشَرَّفُ وَبِنَا تَتَشَرَّفِي وَمَنْ يَعِزُّكِ قَدْ أَهْلَكِ

تجھسے ہمارا شرف اور ہم سے تیری رفعت۔ اور ہم سے زیادہ کون تیری عزت کرسکتا ہے!

رَفرفی بَین العلالی رَبّنا ما یستنزلکْ

اُڑتا، اُڑتا، چمک دمک۔ ارے کون تجھے گرا سکتا ہے؟!

ایران میں وہ عَلم یوں اٹھا۔ یہ نشان، ہندوستان آیا اور سجا کر میدان میں لایا گیا تو اس کی شان اُس کی لچک اور اس کے پنجہ کی چمک دمک پر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہا گیا۔ کہ۔ ؎

اسکی ضیا کے سامنے سورج بھی ماند ہے
(اور) خلقت پکارتی تھی یہ دسویں کا چاند ہے!

سچ کہا ہے ایک ہندو بزرگوار منشی نے ؎

کہ ہے شاہنامہ تماشہ کتاب

اسمیں ذرا ضحاک اور فریدوں کا حال پڑھو۔ جمشید کو مار کر ضحاک تازی، کیانی نسل کے مٹانے پر تُل گیا۔ اس نے چن چن کر اس خاندان والوں کو مارنا شروع کیا۔ کسی طرح ایک کیانی شہزادہ بچ رہا تھا۔ آخر وہ بھی مارا گیا۔ فریدوں نام اس شہزادہ کا ایک بچہ تھا۔ اس کی ماں ضحاک کے ڈر سے، اُسے شہر سے لے بھاگی اور جنگل میں پہونچی۔ وہاں ایک

راہب (درویش) ملا۔ اُس نے اس بچّہ (فریدوں) کو پال نکالا۔ اس درویش کے یہاں پُرمایہ نام ایک گائے تھی۔ اسی کے دودھ سے فریدوں پلا تھا۔ وہ بڑا ہوا تو ماں کے ساتھ پہاڑوں میں چلا گیا۔ یہاں ضحاک کو آخر اس کی خبر لگی۔ ڈھونڈھ ہوئی۔ فریدوں تو ملا نہیں۔ مگر ضحاک نے تاؤ میں اُس غریب راہب اور اُس بچاری گائے کو مار ڈالا۔ ضحاک کے ظلم سے دُنیا عاجز تھی آخر رعایا اٹھی۔ بلوا ہوگیا۔ فریدوں پہاڑ پر اب جوان تھا۔ باپ کے قاتل کا حال سُنا۔ خوش ہوا۔ پہاڑ سے اُترا۔ بلوائیوں سے ملا اور ضحاک سے لڑنے چلا۔ ایک مضبوط گرز بنایا۔ اس پر اپنی مہربان دائیہ، پُرمائہ (گائے) کا سا سر بہ طورِ یادگار رکھّا اور نکلا۔ ضحاک کا آخر مقابلہ کرکے اسی گرز گاؤ سر سے اس کا سر کچلا اور خود بادشاہ ہوگیا۔ وہ گرز تاریخی بنا۔ اس نے بڑی بڑی کرامتیں دکھلائیں۔ وہ رستم کے ہاتھ میں بھی رہا۔ اور ؎

من وگرز ومیدان و افراسیاب

کسے کرکے نے اُسے عمرِ خضری بخشدی!

زمین مصر نے بھی ایسا ہی گل کھلایا۔ فرعون، بنی اسرائیل کا دشمن ہو جاتا اور انھیں چن چن کر مارتا ہے۔ (حضرت) موسیٰ اسوقت ماں کے پیٹ میں ہیں۔ پیدا ہوئے تو اَوۡحَیۡنَا اِلٰی اُمِّكَ مَا یُوۡحٰی۔ ان کی ماں کو حکم آیا کہ بچہ کو دریا (نیل) میں ڈالدو۔ ایک صندوق میں رکھ کر وہ بہا دئے گئے۔ صندوق بہتے بہتے شاہی محل سے جا لگا۔ نکالا گیا۔ اسمیں ایک بچہ (موسیٰ) ملا۔ وہ اسی ایوان میں پلا۔ دائی کی تلاش ہوئی۔ (حضرت) موسیٰ کی ماں (انجانی سے) بلائی گئیں۔ وہ انّا بنیں۔ ان کا دودھ دیا گیا۔ اور یوں حضرت موسیٰ پروان چڑھے۔ پھر جو ہوا، معلوم ہے۔ فرعون نے موسیٰ کے ہاتھ سے نیچا دیکھا۔ یہ اپنی قوم (بنی اسرائیل) کو مصر سے نکال لائے۔ اور کنعان آکر یہودیت کو بڑھانے لگے۔ اور آخر اُن کے سلطان و پیشوا بنے!

ایران و ہند و مصر کی یہ حکایتیں عجیب مزا دیتی اور بڑے بڑے راز کھولتی ہیں۔ قدرت کا ہاتھ ایک جگہ، گرزِ گاؤسر کو طاقت دے کر، ضحاک کے سے ظالم کا سر کچلتا ہے تو دوسری جگہ موسیٰ کو عصا عنایت کر کے اُس سے عجیب عجیب کام لیتا اور آخر فرعون کے سے باغی کو غرق

آب کر دیتا ہے! اخلاق و نصیحت کے لئے ہر ملک اور ہر قوم کی، یکساں تخئیل نظر آتی اور وہ بڑے کام دیتی اور غافلوں کو چونکاتی رہتی ہیں مگر جب شاد (عظیم آبادی) کا یہ شعر یاد آتا ہے تو جی چھوٹ جاتا ہے ؎

دیکھنا غافل ذرا دنیا کو پہچانے ہوئے
کل جو قصّے پیش پا تھے آج افسانے ہوئے

ہم جائیں گے۔ دوسرے آئیں گے۔ ہمارے آج کے سچے قصّے بھی ناسمجھی سے، کل، اُن کی کہانیاں بنیں گے۔ اور وہ اُنھیں ہمارا مذہبی فسانہ (Mythology) کہہ کر ٹالدیں گے۔ اور نفع کے بدلے، گھاٹے میں رہیں گے!!

فردوسی کہتا ہے ؎

خرد گو بدیں گفتہا بگرود ۔۔۔ مگر نیک معنیش می نشنود
تو مردیو را مردم بد شناس ۔۔۔ کسے کو نہ دارد ز یزداں سپاس

یعنی۔ ناسمجھ تو خیر، سمجھدار تو ہمارا کلام و مطلب سمجھیں۔ دیووں اور بھوتوں کے نام سے نہ بھڑکو، یہ بدچلنوں کا دوسرا نام ہے۔ ان قصّوں سے سبق لو اور فائدہ اٹھاؤ! مگر فردوسی پر نظر کی کس نے اور شاہنامہ

کو دل دے کر پڑھا کس نے ؟! خیر اب رستم دستاں اور اس کے گھر کا حال سُنو۔

(۱) زال

(پدر رستم) جیسا کہ سُن چکے۔ سام کے گھر پیدا ہوا تو سر سے پیر تک سفید تھا۔ ایسے بچہ کو دیکھکر اس کا نام زال (یعنی پیر، بُڈھا) رکھا گیا۔ اور پھر سام اُسے ایک جناتی (غیر معمولی) بچہ سمجھکر پہاڑ پر پھینک آیا کہ جانوروں کا شکار ہو جائے۔ وہاں ایک سی مرغ (سیمرغ) نے اس لاوارث کو پال نکالا۔

اب، مشہور یورپین مورخ لیگی (Leggy Page 397) کہتا ہے کہ چین کا ایک پُرانا قصہ ہے کہ وہاں ہوکی (Hau Ki) نام، سفید بھیڑی کا سا ایک بچہ پیدا ہوا جس کے سر کے بال تک سفید تھے۔ اسلئے اسے لاوتزی (Lau Tazi) یعنی نابالغ پیر (Old Boy) کا لقب دیا گیا۔ وہم سے اس بچہ کو، گھر والے، سڑک پر ڈال آئے۔ جانوروں نے اس کی پرورش کی!

(۲) سیمرغ

ہمارے یہاں اس مرغ کی ابتک وہی ایک ٹانگ ہے! اسکے قدو قامت کو یاد کر کے سی یعنی تیس مرغوں والا، کی سی پھبتی اُس پر کسی گئی اور وہ ایسی چھپی کہ ہماری زبان پر چڑھ گئی۔

غُرُب (صفحہ ۵۶۶ اور ۶۰۷) کا سا چینی داں محقق بتاتا ہے کہ اس سیمرغ کے جوڑ کا ایک اور مخلوق رُخ (Rukh) نام چینی قصّوں میں آتا اور وہ بھی بڑے کام دیتا ہے۔ وہاں (چین) انھیں ناموں کے درویش بھی تھے۔ اور ایک دوسرا راہب، تاؤ جن (ganteng Jao jin) بھی تھا۔ یہ لوگ بہت مشہور ہوئے۔ ان کی کرامتوں کے قصے زبانوں پر تھے۔ اور اُن کے بعد اب جو کامل درویش نکلا وہ ان لقبوں کا سزاوار ہوا۔ یہ نام آخر استعارہ بنے اور ادب کی زبان پر مختلف شکلوں میں چڑھ گئے۔

اس مزیدار قصہ میں سر کیوجی (لکچر بر شاہنامہ ۱۹۲۹ و ۱۹۳۲) بھی حصہ لیتے اور اوِستا (پارسیوں کی مذہبی کتاب) کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ پہلوی (قدیم فارسی زبان) میں اس لفظ سیمرغ کو

مرغ سن[1] (Mereg Sen) کہتے ہیں۔ یعنی۔ ایک ہوا باز درویش۔ کثرتِ استعمال سے وہ مرغ سن، سن مرغ اور سیمرغ بنا اور پھر ہماری ہوا میں اُڑتا پھرا۔!

ہمارے پر پرواز بہت بلند رہے ہیں۔ شاہنامہ کا یہ سیمرغ بھی ہمارے ادب کی نوک زباں ہو کر خوب خوب پھڑکتا اور پھڑ پھڑاتا رہا۔ اور آخر وہ بھی ہمارا ہُما اور سرخاب کا پر بن گیا۔ لیکن مثنوی کی "سفر مرغان در طلب سیمرغ" والی نصیحت خیز و مزیدار حکایت اور عطار کی منطق الطیر، فضول پر نہیں باندھتیں بلکہ فطرت کے بہت سے راز کھول دیتی ہیں!

(۳) رستم

سیمرغ اگر سمجھ میں آگیا تو تہمتن ناسمجھی کا شکار نہ بنے گا۔ ابھی تم نے سنا کہ زال کی پرورش کیونکر ہوئی اور قدرت کی مدد سے وہ ایک نہایت خوشش آب و ہوا جگہ میں کس طرح پلا۔ اسلئے اسکا تندرست

---

[1] سن ہو (Sien ho) نام ایک اور پرند و درویش بھی چین کا تحفہ اور غیبی قاصد ہے! یہ ہوا باز پرندنما انسان سمجھے جاتے تھے (غروب، صفحہ ۶۰۷-۵۶۶)

وقوی ہونا لازمی تھا۔ رستم اسی زال کی آل ہے۔ برومند و توانا۔
اُس کے جننے میں ماں کو دشواریاں کیوں کر نہ ہوتیں ؎

یکے بچہ بد، چوگو، شیر وش
بہ بالا بلند و بہ دیدار کش

یعنی شیر سا تگڑا، اور لنبا چوڑا۔ دیکھنے میں ؎

بہ یک روزہ گفتی کہ یک سالہ بُود
یکے تُودہ سوسن و لالہ بُود

پیدا ہُوا تو ماں کے زخم پڑ گئے۔ وہ اُن پروں سے بھرے جو اُس سیمرغ
نے ایک جڑی کے ساتھ یہ کہکر زال کو دئے تھے ؎

گیاہے کہ دادم تو با شیر و مشک | بہ کوب و بکن ہر سہ در سایہ خشک
بر اُن مال ازاں پس یکے پرّ من | خجستہ بود سایۂ فرّ من

رُستم کا حال سنا کہ کیسا پیدا ہُوا تھا؟ اسلئے اُس کا نام تو رکھا گیا
تہمتن (تہم بہ معنی دلاور و بزرگ۔ اور تن ۔ جسم۔ یعنی قوی ہیکل)
مگر لقب پڑا، رستم! یعنی چھپکا ہوا۔ رُستن کے معنی اُگنے کے ہیں
رُست، رُستہ، یعنی اُگا ہوا، تیار۔ رستم کی یہ میم، تون کی جگہ سیستانی

تحفہ ولہجہ ہے۔ جہاں وہ پیدا ہُوا تھا۔

یہ تو ہُوا۔ اب میکنزی (D. A. MacKenzie Page 299)
اور لیگی (Legge) کہتے ہیں کہ۔ چین کی بھی ایسی ہی ایک حکایت ہے۔ ایک رستم وہاں بھی اسی طرح پیدا ہوا۔ اور اس کی ماں کا زخم، کسرائن (Caesarian) نام ایک درخت کی چھال سے بھرا۔ یہ درخت چین میں تھا اور اُس کے خواص چینیوں کو معلوم تھے!

(۴) تیر رستم

اسفندیار کی لڑائی ہے۔ اور ایسی کہ پہلے روز رستم سا مرد اس نبرو سے گھبراتا ہے۔ اسلئے کہ زردشت نے اپنے اُس (اسفندیار پسر گشتاسپ) شاگرد و مُرید پر دعا دم کی ہے[۱] اور اُس کی برکت سے اور ہتھیار تو ایک

---

[۱] شاہ گشتاسب نے اپنے نبی آشو زردشت پر چار فرمائشیں کی تھیں۔
اول۔ بہشت اسی دنیا میں اسے (بادشاہ) دکھادی جائے۔
دوم۔ عالم کے گذشتہ و آئندہ واقعات کا اسے علم ہو جائے۔
سوم۔ اُسے حیات ابدی ملے۔
چہارم۔ جنگ میں کوئی حربہ اُس پر کارگر نہ ہو۔ (باقی بر صفحہ ۱۳۱)

طرف، رستم کا گرز گاؤسر بھی کارگر نہیں ہوتا۔ خیر۔ دونوں دن بھر لڑے اور فیصلہ نہ ہوا تھا کہ رات نے حائل ہو کر انھیں الگ کر دیا۔ رستم اپنے خیمہ میں آیا۔ صبح کی فکر میں ہے

ہاتھ ماتھے پہ کبھی تھا تو کبھی سر زانو پر

بے چین ہے۔ ٹہلنے لگا۔ کچھ یاد آیا۔ غوطہ میں گیا۔ اس عالم میں ہے

گزے دید بر خاک، سر بر ہوا

نشستہ براو مرغ فرواں روا

دیکھا کہ ایک جھماٹ پیڑ جسے گز کہتے ہیں، نظر کے سامنے کھڑا ہے۔ پھنگ اُس کی آسمان پر اور جڑ زمین پر۔ اُس پر شیر سا ایک مرغ بیٹھا شاہی

(بقیہ صنہ ۱۳) زردشت نے کہا کہ یہ چاروں باتیں ممکن ہیں۔ مگر چار علیحدہ شخصوں سے یہ مخصوص ہو سکیں گی۔ کسی ایک کے ساتھ نہیں۔

(۱) شاہ گشتاسپ کو جنت کا نظارہ کرا دیا گیا۔

(۲) جاماسپ (وزیر) کو وہ حکمت ملی کہ وہ دُنیا کے گذشتہ و آئندہ واقعات کا عالم ہو گیا۔

(۳) پشوتن کو حیات ابدی (عمر خضر!) نصیب ہوئی۔

(۴) شہزادۂ اسفندیار (پسر شاہ گشتاسپ) ایسا روئین تن بنا دیا گیا کہ کوئی حربہ

(باقی بر صفحہ ۱۳۲)

شاہی کر رہا ہے۔ اُس نے ؎

بدو گفت، شاخے گزیں راست تر
سرش برتن و مِنش برکاست تر

مرغ[1] نے کہا۔ دیکھتا کیا ہے۔ اس درخت کی ایک سیدھی ٹہنی کاٹ، اس کا تیر بنا ایسا کہ سر اُس کا بہت اونچا رہے اور نیچے کا حصّہ زمین چومتا رہے۔ اس غیبی آواز سے رستم چونکا۔ دیکھا تو واقعی سامنے ایک درخت ہے۔ دوڑا۔ اس کی شاخ کاٹی۔ پھل دار تیر بنایا۔ اور دوسرے روز اسی تیر سہ پہلو سے ؎

(بقیہ صہ ۱۳۱) اس پر کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ (لیکن، پارسیوں کی قدیم مذہبی کتاب اور شاہنامہ خضر، عمرِ خضر اور حیات ابدی حاصل ہونے کا عقیدہ بہت پرانا اور اسلام سے قبل کے مذہبوں کا ایک دلچسپ فسانہ ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم پر حربوں کے اثر نہ کرنے کا قصّہ بھی قدیم ہے۔ لوقا کی انجیل، باب دس، آیت ۱۹ میں ہے کہ۔ حضرت عیسیٰ (تقریبًا بارہ سو برس بعد از اشو زردشت) نے اپنے ایک حواری سے کہا کہ۔ میں تجھے وہ قوت بخشتا ہوں کہ تو سانپ کے کاٹے ہوؤں کو تو اچھا کر دے گا۔ اور دشمن کا کوئی ہتھیار تجھ پر چل نہ سکے گا"! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایسے مُرغ کا کنایہ، غیبی آواز سے ہے جو اضطراب کے وقت انسان سن لیتا ہے۔ دُنیا کے ہر ادب میں ایسے استعارے اور کنائے دکھائی دیتے ہیں!

به زور است بر چشم اسفندیار سیه شد جہاں پیش او نامدار

به دو نوک پیکاں، دو چشمش بدوخت به مُرد، آتش کینه چوں بر فروخت

اسفندیار گو اپنے نبی کی دعا کی بدولت محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ مگر رستم کا تیر، غیب کے اشارے سے بنا بھلہ کارگر ہوا۔ شہزادہ (اسفندیار) کی آنکھ چھدی۔ اپنی قدر اندازی بھولا اور رستم کے آگے ؎

به اُفتاد، چاچی کمانش زِ دست

سرنگوں ہو گیا۔ کمان بنا۔ جھکا اور گر پڑا۔

تمھارے ایک چابک دست (میر مونس) بھی ایک مشہور لڑائی کی ایسی ہی تصویر کھینچی ہے۔ یہی تیروں کی جنگ ہے۔ عباس ہیں اور سامنے شامی قدر انداز۔ اُس کے ترکش خالی ہو چکتے ہیں تو حجازی غازی بڑھتا، پہلوان کو ٹوکتا، اپنی کمان سیدھی کرتا، اور اس کی آنکھ کو نشانہ بناتا ہے۔ تیر پیوست ہوتا اور وہ اپنے ہرنے (گھوڑے) پر سر ڈال دیتا ہے۔ سیاف عرب اب تلوار کا صاف ہاتھ مارتا اور پہلوان ؎

تھا اک تو کور اور بھی بیکار ہو گیا

تصویر نیم رُخ وہ ستم گار ہو گیا

فوج میں ایک غلغلہ اُٹھا کہ ؎

آسفندیار عصر کو مارا دلیر نے

اب جبتک شاہنامہ کھلا نہ ہو اور رستم و آسفندیار کی جنگ سمجھ کر پڑھ نہ لو، اپنے چابکدست کا ہنر کیا سمجھ سکتے اور اس کی کیا قدر کر سکتے ہو۔ اور پھر جبتک مُصوّری میں بھی درک نہ ہو اس تصویر نیم رُخ کا کیا مزا لے سکتے اور دوسروں کو کیا مزہ دے سکتے ہو ؟ !

خیر اب فردوسی کے کرامتی درخت گز، پر نظر کرو۔ وہ دیکھو ؎

گزے دید بر خاک، سر بر ہوا

نشستہ بر اُو مرغ فرماں روا

لے اس شاندار درخت کی حکایت سنو۔

(De Groot vol.6 Page 1295-96) وہی دی غروت

اور میکنزی (Mackenzi Page 141) کہتے ہیں کہ۔ یہ درخت قاز یا گاز (Cassie tree) ہے جس کی سختی فولادی ہے۔ چین کے یہ پُرانے درخت ہیں۔ اور وہاں کے قصوں میں اس کا ذکر آتا اور وہاں وہ بڑے کام دیتا ہے۔ عجب نہیں کہ ہمارے مُلک میں

بھی ایسا ہی کوئی درخت ہو اور اس سے تیر و کمان بن کر ارجن کے
ہاتھ آگئی ہوں! اور فردوسی تو اس گاز کی نسبت یہاں تک کہتا ہے۔

چناں چوں بود مردم گز پرست

یعنی اُس کی کرامتیں دیکھ کر لوگ اُسے پوجنے لگے!

ہفت خواں

رستم کے سفر مازندران کی یہ سات پُر خطر منزلیں اور پُر ہول وارداتیں
ہیں جو اُسے پیش آئیں اور وہ ان مشکلوں سے نکل کر اپنی منزل مقصود
تک جا پہونچا۔ شاہنامہ کا ایک اچھا حصہ اس قصّہ کے نذر ہو گیا ہے۔
یہ ہفتخوانِ (رستم) مشہور اور ہمارے ادب کی زبان پر چڑھا ہوا لفظ
ہے۔ فردوسی نے ہفتخوانِ اسفندیار کو بھی سراہا اور اس بیان میں بھی
اپنا زور لگایا ہے۔ مگر رستم جو میدان لے چکا ہو، وہاں اسفندیار
کے سے شکست خوردہ کی کیا چلتی اور وہ اس (رستم) کے مقابلہ
میں کیا نام نکال سکتا۔

لیکن غروب (Grube Page 623) ایک چینی ہفتخواں سے
بھی ہم کو دو چار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ۔ وہاں کے ہیرو نوشا

(No-Cha) نے بھی رستم کے سے میدان طے کئے اور آخر مِی شن (Mai Shan) کے سے دیو کو مار کر اُس نے نام نکالا۔!

سُہراب

رستم کے سے دیو بند کا یہ دلبند ایک سمنگانی شہزادی تہمینہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ سمنگان اس وقت چین کا ایک صوبہ تھا اور وہاں کے لوگ جری، دھنی بلی اور خوش گلی میں مشہور تھے ۔

چو خنداں شد و چہرہ شاداب کرد
ورا نام تہمینہ، سُہراب کرد

اس کی خوبصورتی اور آبداری کو دیکھ کر ماں (تہمینہ) نے اس کا نام سُہراب (آبدار !) رکھا۔ یہ بھی باپ (رستم) کی طرح قوی و توانا نکلا ۔

چو یک ماہ شد، ہمچو یک سال بُود
بُرش چوں برِ رستم زال بُود

مہینہ بھر کا بچہ، سال بھر کا معلوم ہوتا اور رستم و زال کی طرح خوشحال و بلند اقبال نظر آتا تھا۔

آب ذرا مسیو پیری ڈوری (Pere Dore) کی کتاب،
توہمات چین (Superstition en China Part 2)
اور وارنر (Werner) کی حکایات چین (صفحہ ۳۱۹-۳۱۵)
پڑھو۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔ چین کے مشہور پہلوان لی چنگ (Liching)
کے یہاں نوشا (Nocha) نام ایک ایسا خوبصورت وقوی لڑکا
پیدا ہوا کہ اپنی آب وتاب میں گوہر اور قد وقامت میں شیر بچہ معلوم
ہوتا اور وہ یکماہہ، یکسالہ نظر آتا تھا۔ اس کا نام نوشا یعنی آبدار موتی
(Intilligent pearl) رکھا گیا اور بہت خوشنام رہا۔
یہ وہی نوشا ہے، ہفتخوان چین جس کی طرف منسوب ہے!

تعویذ

رستم چند دن اپنی بیوی تہمینہ پاس رہ کر رخصت ہوا۔ چلتے
وقت اس نے اُسے ایک تعویذ (یا مُہرا) دیا تھا کہ بچہ ہو تو حفاظت
اور شناخت کے لئے اُس کے گلے میں یا بازو پر باندھ دیا جائے۔
یہ وُہی مشہور تعویذ ہے جس سے وہ (بچہ، رستم والی جنگ میں پہچانا گیا۔
آب وہی مُصنّفین (پیری ڈوری اور وارنر) کہتے ہیں کہ۔ نوشا کو

بھی اس کے باپ لی چینگ نے ایک جوشن دیا تھا جس نے بڑی بڑی کرامتیں دکھائیں!'

گُردآفرید

شہنامہ میں ہے کہ سہراب نے ایک قلع فتح کر کے اُس کے قلعہ دار ہاجر کو گرفتار کر لیا۔ اُس کی بیٹی گردآفرید، باپ کا بدلہ لینے کھڑی ہو گئی۔ سہراب سے لڑی۔ مگر دونوں محبت میں گرفتار ہو کر ایک دوسرے سے شکست کھا گئے۔

وارنر کہتے ہیں کہ نوشا نے ایک پہلوان تینگ چیوگنگ (Ten Chu Kung) کو شکست دی۔ اِس پر اُس کی ایک بیٹی نوشا کے مقابلہ میں آئی اور بڑے معرکے رہے۔ (Warner (Page 147

جنگ رستم و سہراب

سہراب پیدا ہوا تو اُس کی ماں تہمینہ نے رستم کو لکھا کہ اُس کے یہاں لڑکی ہوئی ہے۔ اور یہ اس خیال سے کہ اگر رستم کو بیٹے ہونے کی خبر لگی تو اُسے بلا لے گا اور اپنی طرح اُسے بھی لڑائیوں میں لگا دے گا۔ رستم

یہ خبر پاکر افسردہ اور خموش ہو گیا اور سمجھتا رہا کہ تہمینہ کو واقعی لڑکی ہوئی ہے۔

اودھر سہراب جوان ہوا، اور اپنے باپ دادا کی طرح اُس نے بھی ہاتھ پیر نکالے۔ ماں سے سُن چکا تھا کہ اُس کا باپ مشہور رستم ہے۔ خون میں وہی جوش اور آبائی ولولہ تھا۔ اتنے میں توران و ایران کی پھر جنگ چھڑی۔ یہ (سہراب) تورانیوں کا طرفدار ہو کر اور یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ ؎

بہ بزم ہم از گاہ کاؤس را
از ایران بہ بزم پئے طوس را

کاؤس کا تخت دیکھو اُلٹتا اور اُس کے افسر سپاہ طوس کا ابھی سر لاتا ہوں!

سہراب چلا، تورانیوں سے ملا، افراسیاب کے لشکر کا سردار بنا اور ایران کی طرف بڑھا۔ یہاں کاؤس کو ایسے جوان و دلیر کی آمد کی خبر ہوئی تو گھبرایا۔ اور اُس کے مقابلہ کے لئے بہ منت رستم کو بلایا۔ لکھا کہ۔ قیامت آگئی ؎

یکے پہلوانیست گرد و دلیر — بہ تن ژندہ پیل و بدل نرہ شیر
از ایران ندارد کسے تاب او — مگر تو کہ تیرہ کند آبِ[۱] او

ایک نیا پہلوان پیدا ہوا اور تورانیوں کی طرف سے آرہا ہے۔ سوا تیرے دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جلد آ، ایران کی خبر لے اور اُسے ماند کردے۔ تخت کیان کی آبرو اور درفش کاویانی کی عزت اب تیرے ہاتھ ہے! رُستم بوڑھا ہوچکا اور خانہ نشین تھا۔ مگر ملک پر ایسی مصیبت کا حال سُنکر نوجوانوں کی طرح بل کھانے لگا۔ گھر سے نکلا اور کاؤس سے جا ملا۔

یہاں مسیو غُروب (صفحہ ۱۹۳) کہتے ہیں کہ۔ چین کے رستم دستان لی تسنگ (Li Tsing) اور اس کے بیٹے نوشتا (ثانی سُہراب) کا معرکہ بھی چین میں اسی طرح پیش آیا۔

رستم ایران آ لیا تو کاؤس اُسے لیکر تورانیوں کے مقابلے میں نکلا۔ لشکر چلا ؎

[۱] اس آب میں لفظ سہراب کی رعایت ہے۔ اسکا لحاظ کر کے ہمنے بھی تیرہ کا ترجمہ ماند کردیا۔

ہَوا نیلگوں شد، زمیں آبنوس   بہ جنبید ہامون ز آوائے کوس

سِلحشوروں کی کثرت و وحشت، باجوں کی کرخت و سخت آوازوں سلاح جنگ کی شدّتوں اور حدّتوں سے ہَوا غلیظ و گرم ہوئی، زمین دہکی، پہاڑ ہلے اور ڈول گئے! اَیرانی و تَورانی بھِڑے۔ سہَراب کی رستمی نے کاؤس کے لشکروں کو تہ و بالا کر دیا۔ کس کا یارا جو اُس کا وار انیارا کرے۔ کاؤس چُپ، رَستم خموش، فوج ششدر اور لشکر میں بھگدڑ رہے۔ دن گذرا۔ رات آئی۔ افسران سپاہ ملے، بیٹھے، شوریٰ ہوا۔ رستم، سہَراب کے مقابلہ پر تیار ہو گیا۔ دلاوروں کی جان میں جان آئی۔ سانس لی۔ اور ؎

تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

صبح ہوئی، سورج نکلا، فوجیں بھی نکلیں۔ رستم اُس وقت اپنا نام بدل کر میدان میں آیا۔ سہَراب ادھر سے بڑھا اور دونوں گتھ گئے ؎

بہ شمشیر ہندی بر آویختند

ہمی زآہن آتش فرو ریختند

تلواریں شپا شپ چلنے، اُن سے آگ نکلنے اور شعلے بھڑکنے لگے۔

باپ، بیٹے لڑ رہے ہیں، زخم کھا رہے ہیں۔ مگر ایک دوسرے کو پہچانتا نہیں ہے۔ اس رستخیز میں شام ہو گئی۔ دونوں کا پردہ رہ گیا۔ دوسری صبح، صبح قیامت تھی۔ رستم و سہراب میدان میں اُتر آئے۔ اور تلوار چلنے لگی ؎

بہ زخم اندروں تیغ شد ریز ریز
چہ رزمے کہ پیدا کند رستخیز

تلواریں ٹوٹ رہیں، زخم پڑ رہے، بریز، بریز ہے اور گریز اگریز۔ قیامت ہے، تماشہ ہے۔ میدان میں دو ہیں ؎

یکے سال خوردہ یکے نوجواں

سہراب تھک گیا اور رستم بھی ہانپ رہا ہے۔ جوان نے بڈھے کی حالت دیکھی۔ تلوار روک لی۔ اور لڑائی دوسرے دن پر اُٹھ رہی۔ رات، مرہم پٹی میں کٹی۔ صبح ہو گئی۔ سورج پھر اپنی شان سے نکلا۔ رستم و سہراب بھی کمریں کس کر نکلے۔ آج آخیر دن اور فیصلہ ہے۔ دونوں میدان میں کودے۔ اب تلواریں توڑی گئیں اور نیام ٹکرے ٹکرے کیے گئے۔ پہلوان نزدیک آئے ؎

بہ کُشتی گرفتن نہادند سر
گرفتند ہر دو دوالِ کمر

پٹکوں پر ہاتھ پڑے۔ گاؤزوریاں شروع ہوگئیں۔ رستم نے آخر سہراب کو پکڑا، ہچکولہ دیکر اٹھایا۔ سر سے اونچا کیا، چکّر دیا اور دے پٹکا ؎ زدش بر زمیں بر، بہ کردارِ شیر
بدانست گو ہم نماند بہ زیر

ایک شیر زمین پر گرا، اور تڑپنے لگا۔

رستم، سہراب پاس کھڑا ہوگیا۔ وہ نیم جاں تھا۔ سہراب نے دیکھا۔ کہا کہ "پہلوان تو نے اچھا نہ کیا۔ خیر ہم تو گئے۔ مگر تیری بھی خیر نہیں۔ میرے باپ کو خبر ہوئی تو بُرا ہوگا!" پہلوان نے پُوچھا۔ تیرا باپ کون ہے۔ کہا۔ رستم! پُوچھا۔ وہ کون؟ جواب دیا۔ رستم دستاں! تہمتن، ششدر ہوگیا۔ کہا۔ نہیں! جواب ملا۔ "ہاں! مگر قسمت کہ مرتے وقت بھی باپ کو نہ دیکھا" تہمتن آپے سے باہر ہوگیا۔ کہا ؎

کہ رستم منم کم بہ ماناد نام
نشیناد بر ماتم پورِ سام

ہم ہی تو رستم ہیں۔ مگر تیری کیا سند ہے؟ سہراب نے اُسے بغور دیکھا کہا کہ۔ میرا بازو کھولو۔ دیکھو ایک جوشن ہے۔ اس میں وہ مُہرا ہے جو بہ طور نشانی میری ماں تہمینہ کو تم نے دیا تھا!" رستم جھکا۔ تعویذ کھولا۔ اپنی مُہر دیکھ کر سینہ پر ایک گھونسہ مارا، گریبان پھاڑا، اور دیوانہ ہوگیا!

نوشدارو

سہراب، نیمجاں شیر کی طرح تڑپ رہا ہے۔ کاؤس کو خبر ہوئی۔ بادشاہ آیا۔ رستم، بیٹے کے سرہانے کھڑا بیٹ رہا ہے۔ کاؤس وہیں وہیں بیٹھ گیا۔ حکم دیا۔ نوشدارو لاؤ۔ اسے دی جائے کہ یہ جی جائے۔

دوا آتے آتے سہراب رخصت ہوگیا ؎

نوشدارو کہ پس مرگ بہ سہراب دہند

کڑیل جوان، بڈھے باپ کے سامنے ختم ہوا۔ اُف ایک کُہرام مچ گیا!

آب، غروب اور دوسرے چینی محققین کہتے ہیں۔ کہ مثنوی فینگ شن میں یہی واردات (سہراب چین) نُوشا (Nosha) کی نظر آتی ہے۔ مگر وہاں نوشدارو کے بدلہ کوئی اور دوا، ایمبوروسیا، (Ambrosia) کی سی اُسے فوراً دی گئی۔ اور وہ جی گیا۔

اے کاش، کاؤسس اور جلدی کرتا۔ فوراً وہ دارو آتی اور سہراب جوان اور یوں نہ مرتا!

شاہنامہ جس نے نہیں پڑھا اُس نے پڑھا کیا۔ اور جس نے فردوسی کو نہ سمجھا وہ سمجھا کیا۔ ہر کلام کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس مقصد کو سمجھکر کلام پرکھا جاتا ہے. مقصد جتنا ارفع ہوگا، کلام اتنا ہی عالی سمجھا جائے گا۔ انسان کی خلقت کا بھی کوئی مقصد ہے۔ اور اس میں بڑا مقصد اُس کی حیات ہے جس کے بغیر یہ کارگاہِ عالم قائم نہیں رہ سکتا۔ انسان ہمت و مردانگی کی بدولت زندہ رہتا ہے۔ اسلئے جو کلام ہم کو باہمت بنائے وہ اصلی کلام ہے۔ اور جو بیان ہم کو کم ہمت بنائے، پستی کی طرف لے جائے اور مُردوں میں ہمارا شمار کرائے وہ کلام نہیں کچھ اور ہے! شاہنامہ کا ہر بیان اور اُس کی بیشتر داستان ایک سبق دیتی اور ہمارے خون میں تحریک و جوش پیدا کرکے ہم کو قبل از وقت مرنے سے روکے رہتی ہے! خیر۔ اب ایک اور مزیدار بیان سنو اور فردوسی پر فاتحہ پڑھکر اس کے شاہنامہ کو

کو بند کرو!

سَرو

عجب معشوق ہے۔ اِسے شاعروں سے پوچھئے۔ اُنھیں اِدھر اپنے یار کا خیال آیا اور یہ سَرو اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا، اُس کا قد بننے لگا اور وہ بھی بندھنے لگا۔ مگر ہمارے اُن عُشاق کو یہ سُنکر ایک دھچکا لگے گا کہ اُن کا وہ سَرو بوٹا سا نہیں، بلکہ بہت لنبا تڑنگا ہے!۔

مسٹر جی، پی ٹیٹ (Mr. G. P. Tate) اپنی کتاب سیستان (صفحہ ۱۹۰ - ۱۸۸) میں ہمارے شُعرا کے معشوقِ سرو قد کا حال یوں کھولتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ۔ میں نے سیستان میں اصل سَرو دیکھے یہ آسمان سے باتیں کرتے اور ۹۶ فٹ سے زیادہ اونچے اور ۱۷ فٹ کے دور میں تھے! یعنی ہماری غزلوں کا معشوق، سرو قد بندھا، تو کچھ اور تو ایک طرف اُس (یار) سے نہ کچھ اپنی عرض کر سکتے اور نہ اُسکی کچھ سُن سکتے ہیں!

مگر فردوسی، اس معشوق کو نہ معلوم کیوں اتنا بڑا بناتا ہے۔ وہ

کہتا ہے ؎

درختست بہشتیش دانی ہمی　　کجا سرو کشمرش خوانی ہمی

چرا کس نہ خوانی نہالِ بہشت　　کہ چوں سرو کشمر بہ گیتی کہ کشت؟

یہ سرو تو قدرت کا نمونہ یعنی ایک بہشتی (Clestial) پودا ہے۔ کشمیر سے اسے کیا علاقہ۔ ایسا نہال زمین پر کب آیا اور کب لگایا گیا؟!۔

مشہور مورخ دی غروت (جلد ۴ صفحہ ۲۸۷) کے سے محقق ہم سے کاہلوں کو جانتے ہیں۔ اسلئے زیادہ زحمت دینی نہیں چاہتے اور خود کہہ دیتے ہیں۔ کہ۔ یہ سرو، دنیا کے عجائب درختوں میں سے ہے۔ اس کے پتے بڑی بڑی بیماریوں میں کام آتے اور اُس کی چھال طرح طرح کے پھوڑوں کی دَوا ہے اُسے ایک خاص کیمیاوی ترکیب سے جوش دیکر پیو تو ہمیشہ جوان بنے رہو!'

یہ سرو آزاد کہا گیا ہے۔ یعنی بے پھول اور بے پھل عجب مزیدار کنایۂ (آزاد) ہے۔ قدرت بڑی منصف ہے۔ اُسے پھل پھول نہ دیا تو اس کے عوض اس میں ہزار وہ خواص دیدئے جو گلوں سے خوبصورت تر

اور میووں سے بہتر، ترم تر یعنی سدا بہار ہیں۔ ان خاصیتوں نے
اُسے معشوق جہاں بنا دیا!!

۵ کجا سرو کشمرش خوانی ہمی

یہ معمہ رہا جاتا ہے۔ اِسے بھی حل کر لو۔ کِش کہتے ہیں، وسیع جگہ کو،
اسی سے کشور نکلا۔ یعنی بڑی زمین والا۔ جیسے بادشاہ۔ اور مَر کہتے
ہیں، گل ولالہ، یعنی پھولوں کو۔ اس لئے کِشمَر کے معنے ہوئے، تختہ
گُل۔ شاہ گشتاسپ کے زمانہ میں سیستان کا ایک حصہ، خطۂ کشمیر تھا۔
زرخیز اور پھولوں سے لدا ہوا، ہرا بھرا۔ یہ ایرانی، مشرقی سرحد تھا۔
اس وقت کے پیامبرِ عجمی، آشو زرتشت اسے دیکھکر کھل گئے۔
اُنھوں نے اس جگہ کو اور گلزار بلکہ اِرم بنا دیا۔ کہاں کہاں سے سرو
کے پودے منگائے، وہاں لگائے۔ اس کی قلمیں لیں اور اطراف
میں لگا دیں۔ شاہ گشتاسپ کو خبر ہوئی، پھولا نہ سمایا۔ سمجھا کہ اُسکی
زمین پر بھی سرو کا سا نمونۂ قدرت کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے نبی
(زردشت) پر فرمائش کی کہ۔ ایک خاص درخت وہاں اپنے
ہاتھ سے لگائیں، رحمت و برکت بڑھائیں اور ایران کو بیماریوں سے

بجا کر، بہشت بنائیں گے۔ عرض قبول ہوئی۔ اُس فارسی پیامبر اور شاہ وقت (گشتاسپ) کا اس پر نام کھُدا، اور وہ نامدار بنا۔ (شاہنامہ) درخت کی خاصیتوں اور اس خاص سرو کی برکتوں اور زردشت کو یاد کر کے فردوسی نے کہا ہے ؎

درخت بہشتیش دانی ہمی کجا سرو کشمرش خوانی ہمی
چرا کس نہ خوانی نہال بہشت کہ چوں سروِ کشمر بہ گیتی کہ کشت؟!

سرو کی ایسی رُوح پرور داستان اور پھر زردشت کے نہال کا حال بیان کر کے ہمارے دی عزّوت اور دوسرے مؤرخین کہتے ہیں کہ ۲۴۶ھ تک وہ متبرک سرو بھی وہاں (سیستان) تازہ تھا، مگر متوکل (عباسی) کے تیشۂ ظلم سے وہ بھی شہید کر دیا گیا، ؎

یوں اصل کٹی ہے نخل آرزو کی!!

گشتاسپ کے بعد دارا تک یہ سرو، آزاد و آباد رہا۔ اس نے مصر لیا تو اپنی زمین کی یہ برکت وہاں بھی سپرد کر آیا۔ اُسے گلستان بنایا، باغ لگائے اور اپنے خوبصورت سرو کو یوسفؑ کی زمین پر بھی اُس نے کھڑا کر دیا۔ وہاں کے شہر ہلیاپلس (Holis Polis)

یعنی (مدینۃ الشمس) قدیم قاہرہ کے گھر گھر میں سرو لگا اور محلوں کی زیب و زینت بنا! - میکس مُلر (W. Max muller --

(Egyptian mythology Page 37

قدیم مصری زبان میں ہلیا (Holia) کے معنی شمس، آفتاب کے ہیں اور پُلس (Police) شہر، یعنی مدینۃ الشمس۔ یہی پُلس (Police) بگڑ کر پولیس بنا یعنی شہر کا داروغہ۔ یہ قدیم شہر اُجاڑ ہو گیا تھا۔ اب پھر بس رہا ہے۔ اسی میں وادی القمر یعنی لُونا پارک (Luna Park) کا سا ایک ولایتی چکّر بھی ہے۔ شوقین اس پارک کی سیر اور سرو کی زیارت کرتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے ایام بہار یعنی مارچ میں، آپ کا ایک رِند سیلح وہاں بھی پہونچا۔ وہ نڈر ما زین یوسف کو چومتا کسی سرو کو بھی آنکھوں سے لگاتا اور مزے لیتا رہا۔ بڑے بڑوں کے احتساب سے وہ نہ ڈرا، اور برملا کہتا رہا کہ ؎

وہ ماہِ مصر دن کو ہی ہلیا پلس میں ساتھ ... پھر وادی القمر میں جہاں رات ہوتی ہے!

ختم کلام

بہ پایاں رسیدیم ایں داستاں

اب اپنے خامہ پرور عزیزوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ ہماری عمروں کا پیمانہ چھلک رہا ہے

چو برداشتم جام پنجاہ و سہ
ندارم بجز یادِ تابوت بہ

جو کہنا تھا کہہ چکے اور گور کے سوا سب بھولے ہم نے دل اور میدان دونوں چھوڑا۔ اب وہ بڑھیں آئیں، اگلوں کے خلف بنیں۔ ان میں اپنے بزرگوں کا خون ہے، شاہنامہ پڑھکر اُسے گرمائیں اور دوڑائیں صحیح ادب کو دلوں میں رچائیں۔ خود کو مرد بنائیں اور اپنے باپ دادا کی جگہ لیکر مُلک و قوم کو آگے بڑھائیں۔ اب آؤ جس نے ہمیشہ دلوں کو فتح کیا اُسکی رُوح پُرفتوح پر اسوقت کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھو اور سعدی کی زبان سے پکار کر کہو

کہ رحمت بر آں تربتِ پاک باد

والسلام

بقلم محمد عبد الغفار خوشنویس ڈنکہ کی املی۔ پٹنہ۔

ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت شاد عظیم آبادی کی یادگار کتابیں

فکر بلیغ

از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم

یہ وہ کتاب ہے جس کے ایک مرتبہ پڑھنے سے تمام فن شاعری کی کافی معلومات ہو جاتی ہے اور انسان شعر لکھتے وقت غلطی سے بچتا ہے ہر سخن فہم و سخن گو کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔ سائز ۲۶ × ۲۰

باوجود اعلیٰ قسم کا کاغذ و ایک سو ساٹھ صفحے کے قیمت صرف عہ

ظہور رحمت (منظوم)

بالکل اچھوتی نئی اور موثر کتاب ہے اس میں نبی کریم صلعم کے حالات زندگی درج ہیں۔ جسمیں مندرجہ ذیل مضامین ہیں:۔

نعت
آپ کا حلم
بیان ولادت
آپکے آنے کی ضرورت
آپ کا مرتبہ
حالات بعثت
اہل عرب کے زمانہ جاہلیت کے حالات۔ معراج
تعلیم
طلب مئے معرفت۔ حالات براق
آپ کا اخلاق
بیان حالات شب مبارک

ساتھ ساتھ علامہ سید سلیمان (ندوی) و اختر صاحب کا مقدمہ۔ کتابت و طباعت و کاغذ بہترین سائز ۲۶ × ۲۰ / ۱۶ صفحات ۱۴۴ قیمت ۸ علاوہ محصول ڈاک

خاموش ہے کیوں مرثیہ خوان اُردو - تھا ختم ابھی کہاں بیان اُردو
نیند آگئی داستان سنانے والے - اب کس سے سنینگے داستان اُردو
سیماب - اکبر آبادی
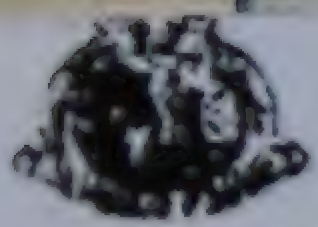
تصویر خیال کھینچتی ہیں آنکھیں
صد نقش کمال کھینچتی ہیں آنکھیں
ظاہر ہے ادیب ملک کے خامہ سے
کیا بال کی کھال کھینچتی ہیں آنکھیں
ظہیر - عظیم آبادی